# تاریخ ادب اُردو (مصوّر)

(یعنی)

## ہسٹری آف اُردو لٹریچر

مصنّفہ

عالی جناب رام بابو صاحب سکسینہ۔ ایم۔ اے ایل ایل
بی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ایم ایے
ایس۔ بی۔ ممبر ہندوستانی اکیڈمی یوپی ڈپٹی کلکٹر۔
مصنّف اُردو شعراء زمانہ حال و اوراق پریشان

مترجمہ

جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے سابق ہیڈ ٹرانسلیٹر گورنمنٹ آف انڈیا

باہتمام کیسر یداس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

مطبع منشی نولکشور واقع لکھنؤ میں طبع ہوکر شایع ہوئی

# انتساب
## باجازت خاص

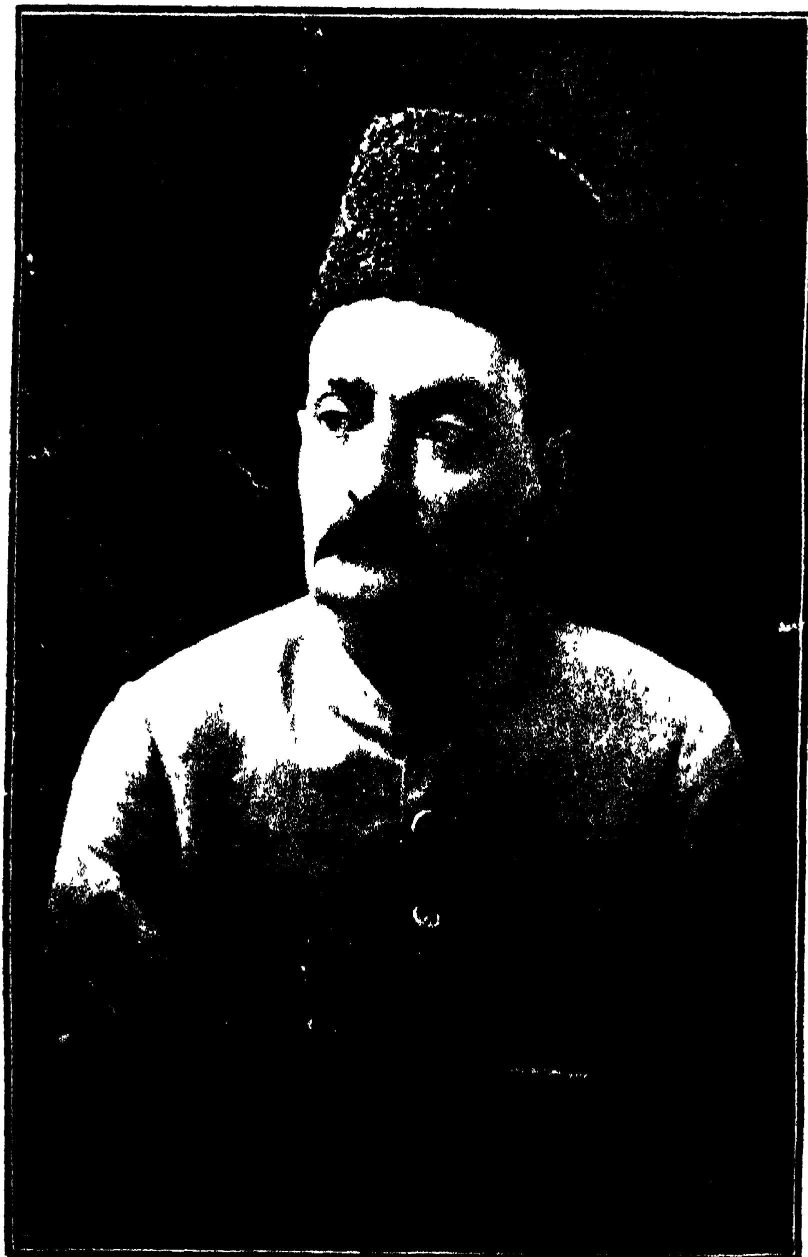
یہ ناچیز تالیف

اعلیحضرت عالیجاہ فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ مخلص الدولہ ناظم الملک امیر الامرا
ہز ہائنس نواب سر سید محمد حامد علیخان بہادر مستعد جنگ دام اقبالہٗ جی سی
ایس آئی جی سی آئی ای جی سی وی او ایل ایل ڈی سی ہیمالک معظم فرمانروائے رامپور کے
نام نامی کے ساتھ معنون کیجاتی ہے جنکے مبارک عہد میں اور جنکے نامور سلف
کے مبارک زمانہ میں ادب اُردو کی قدردانی اور ترقّی اور مشہور شعرا اور
اہل فن کی سرپرستی خاص طور پر ہوتی رہی ہے جس کی وجہ
سے ادب اُردو حضور والا کا ہمیشہ ممنون احسان
رہے گا۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف



ہزہائینس سر سید حامد علی خاں بہادر جی - سی - ایس - آئی
جی - سی - آئی - ای جی - سی - وی - او والئی رامپور



مرزا محمد عسکری بی—اے مترجم کتاب ہذا

# فہرست مضامین

## باب ۵
## اساتذۂ دہلی
### حصۂ اول طبقۂ متقدمین
### حاتم و آبرو کا زمانہ

# باب ۶

## اساتذۂ دہلی

## حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

## میر و سودا کا زمانہ

## باب ۷

## اساتذہ دہلی

## طبقۂ متاخرین

## باب ۳

### اساتذہ لکھنؤ

### ناسخ و آتش کا زمانہ

## باب ۹

### دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا

### واجد علی شاہ اختر کا عہد

## باب ۱۰

### مرثیہ اور مرثیہ گو

## باب ۱۴

## اردو شاعری کا جدید رنگ

## آزاد اور حالی کا زمانہ



مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف اصل کتاب (ہسٹری آف اُردو لٹریچر)

# فہرست تصاویر حصۂ نظم

# تمہید

(از مصنّف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اُردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لیکر زمانہ حال تک مع مشہور شعرا اور نثّاروں کے مختصر حالات زندگی اور اُنکے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کیگئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اسمیں وضاحت سے بیان کیے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں جسمیں کہ وہ شعرا اور نثّار گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانہ کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اسمیں پوری کوشش کیگئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اسکی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کیجائے تاکہ انگریزی داں جماعت بھی ادب اُردو سے کماحقہٗ واقف ہوجائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے تقریباً چار برس کا عرصہ گذرا کہ اُسنے باوجود اپنی سرکاری مشغولیتوں کے اس کتاب کو ختم کردیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں ردوبدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانۂ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہوجائیں۔ یہی وجہ اُس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اُردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدہ کے لئے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جسقدر میں آگے بڑھتا گیا اور اسکی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ نقص آیندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائیگا۔

اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فروگذاشت جان بوجھکر کی ہے اور سند میں پروفیسر سنٹسبری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جسکے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آیندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جسمیں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس معہ انکے انگریزی ترجمہ کے اور اگر ممکن ہوا تو منظوم ترجمے کے بتفصیل دیے جائیں۔ یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیے جاسکے۔ اسکی تلافی انشاءاللہ یوں ہو جائیگی کہ اک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اُردو" ہوگا شائع کیا جائیگا۔

ایک دوسرا اہم فروگذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دور موجودہ کے اُردو شعرا کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سنٹسبری کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کرونگا

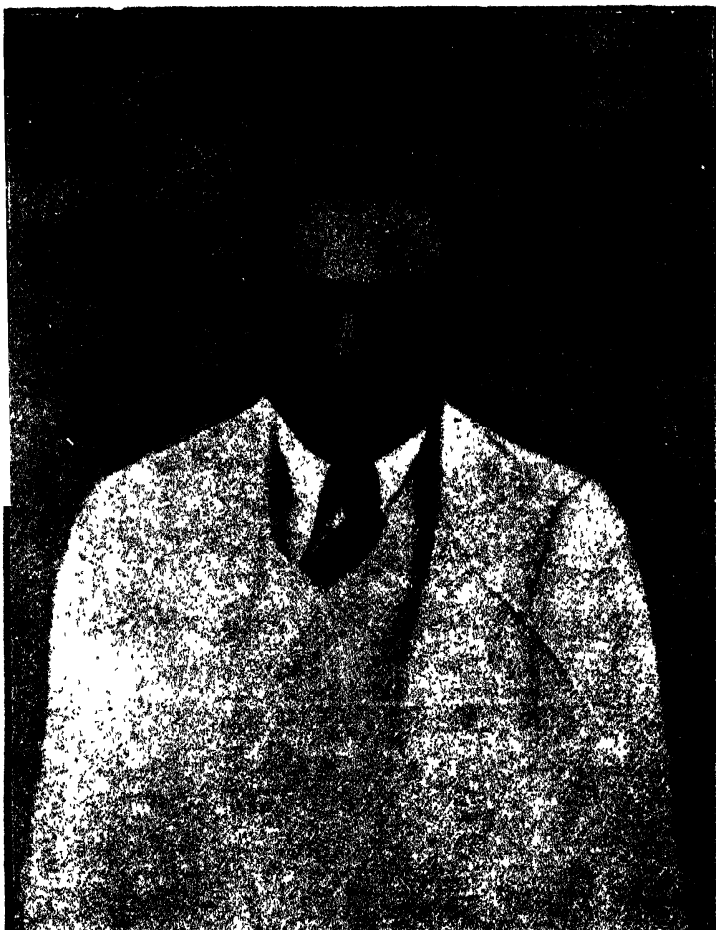
ماگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جسمیں کوئی غلطی نہیں ہو تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جسمیں کوئی غلطی نہ ہو وہ اُس سے بڑھکر لغو ہے" مجکو اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جنکی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کیجا سکی -

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مجکو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائیگی اگر میں اسکے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس ادب لطیف یعنی ادب اُردو کا صحیح ذوق پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے اور اُنکو شوق دلاؤں کہ وہ اس قصر عالی کو جسکی میں نے صرف بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہونچا دیں -

میں تہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جنکی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا مگر اسکا اعتراف متن میں نہ کر سکا (۲) اُن تمام صاحبان کا جنھوں نے مجکو کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا (۳) اُن حضرات کا جنھوں نے مسودۂ کتاب پڑھا اور تصحیح پروف میں میری مدد کی (۴) اُن کا جنھوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے لہذا میں اُن سب کا مجموعی حیثیت سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں -

رام بابو سکسینہ

از بریلی (یوپی)



سر تیج بہادر سپرو کے - سی - ایس - آئی ایل - ایل - ڈی

# تقریظ

داشر عالیجناب فضیلت انتساب سر تیج بہادر سپرو صاحب ایم۔اے۔ال ال ڈی۔کے سی ایس آئی

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسۂ کانووکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبان اُردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں۔ ہمارے صوبہ کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اُس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ اُن پر اُنکی زبان اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جسقدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو در اصل کمیونلزم (فرقہ بندی) کا مرادف ہے نقصان پہونچایا اتنا اور کسی چیز نے نہیں پہونچایا۔ ہمارے صوبہ کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجوئیٹوں اور انڈر گریجوئیٹوں کو دیکھکر سخت افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی سے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ دلوں سے اُس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جسمیں خود اُن کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گذرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے مسلمانوں سے ملکر بھی نہایت صدمہ پہونچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اُردو سے بے توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو لبریز ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ اُس میدان ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سر چشمۂ اتحاد

مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔

میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانۂ حال میں لوگوں کو ایک قسم کا ادبی اشتغال ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام کتنے دیرپا ہونگے یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مرور ایام سے ملیگا۔ جسقدر نظمیں فی زماننا لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم نثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ آئڈیل ہوتا ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کی مثال پوری طرح صادق آتی تھی اور اُن کو ایک اعلیٰ درجہ کی بدمذاقی کا نمونہ پایا۔ ہماری نثر کی بھی یہی حالت سمجھنا چاہیئے۔ چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمارے خیالات میں بلندی یا ہماری دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہو بلکہ وہی کمبخت پُرانے عشق و عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی بیوفائی اور مکاری اور یا ادنیٰ درجہ کی رکیک سازشوں اور چالاکیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے اس خیال میں تمام ادبار اُردو بالکلیہ داخل نہیں ہیں لہذا میں اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار رہوں کہ الحمدللہ ہم میں چند افراد ایسے ضرور ہیں جنکے ادبی کارنامے گو مقدار میں کم سہی مگر بلاشک نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ شعرار اُردو کی پوری تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صفحۂ ہستی پر چھوڑ جانے والے ہیں اُنکی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں کسی مقام پر ادب اُردو کی قرار واقعی دیرپا اور مفید خدمت انجام دیجاتی ہے تو وہ حیدرآباد دکن ہے۔

انھیں اسباب سے یہ میرے لئے خاص طور پر قابل مسرت ہے کہ ہمارے اسی صوبہ کے ایک گریجویٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو اتنا وقت ملا کہ باوجود اپنی سرکاری مصروفیتوں کے اُنھوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادب اُردو کی تاریخ پر تیار کردی۔ مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب "آبحیات" سے کون واقف نہیں لیکن وہ ضروریات زمانۂ حال کے مطابق نہیں ہی۔ اسکے علاوہ بعض اور کتابیں زمانۂ موجودہ میں بھی اسی بحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوت امتیاز اور روشن خیالی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے اس کتاب کے مسودہ کو میں نے بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر چند کہ بعض باتوں میں مصنف کی تجاویز سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر قابل مصنف کی اس بارہ میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقہ سے اُنھوں نے زبان اور ادب اُردو کی ترقی اور نشوونما کا حال قدیم زمانہ سے لیکر زمانۂ حال تک کا لکھا ہے۔ ممکن ہی کہ اس کتاب کے آیندہ ایڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بیباک ہیں۔ مثلاً میں اس کتاب کے باب ۳ کو پیش کرتا ہوں۔ اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کیجا سکتی ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کرونگا۔ مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہی جسکے واسطے تمام بہی خواہان اُردو کو لائق مصنف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسانمند ہونا چاہیے۔ یہ کتاب یقیناً اُن تمام اصحاب کو پسند آئیگی اور میری رائے میں ضرور آنا چاہیے، جو اس بات کی تحقیق چاہتے ہیں کہ زبان اُردو کس طرح عالم وجود میں آئی مختلف اُستادوں کے

ہاتھ سے اُسمیں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ترقی کے مختلف ادوار نے اُس پر کیا کیا اثرات کیے۔ آخر میں میں یہ ضرور کہونگا کہ سول سروس صوبہ کے حکام اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مل جائے کہ وہ اُسکو کسی ادبی خدمت میں صرف کر سکیں مگر رام بابو صاحب نے اس کلیہ کو توڑ دیا اور دُنیا کو دکھلا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرو

# التماسِ مترجم

ادب اردو تشنہ تھا کہ اُسکی قدیم تاریخ یعنی اُسکی ابتدا اُسکی نشو و نما، اُسکی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُسمیں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہو جنھوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صدہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت صراحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دوروں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمعِ ہدایت کا کام دیتے ہیں متاخرین میں آبِ حیات اور جلوۂ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہمکو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اُسکی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرضِ شک میں ضرور پڑ گئے ہیں پھر بھی اپنی صنف میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جسکا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جبکہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو بآسانی معلوم ہو سکے قلمبند کر دیے اور کچھ نمونے اُنکے کلام کے پیش کر دیے اور مختصر طور پر اپنی رائے اُنکے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور تغیرات جو اُنکے عہد تک رونما ہوئے تھے اُسکے بیان کرنے کے تو شائق تھے اور نہ اسکو وہ ضروری سمجھتے تھے میری رائے میں اسکا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان کی ابتدا اور ارتقا اور اُسکے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی۔ مگر میری ناچیز رائے میں

اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرز ادا بجائے سادہ اور سائنٹفک رکھنے کے اُنھوں نے نہایت رنگین اور پُر تصنع رکھا جیسا کہ اُنکی تصانیف کا ہے اور اس کا خیال نہیں رکھا کہ یہ تصنیف ایک خاص نوعیت کی ہے اور انکی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ اُنکی کتاب اسقدر دلچسپ ہوگئی کہ اگر ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجئے تو پھر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد طبیعت اُس سے اکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستان سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زمانناُ اسپر بیدردی سے کیے جا رہے ہیں یہ بھی اُسی عبارت کی رنگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو پُر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہار واقعات میں ایک مورخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا ایسے پُر زور اور رنگین الفاظ استعمال کئے گئے جو اُس موقع کے حسب حال نہ تھے۔ تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات کی بوچھار جو اُس پر ہو رہی ہے میری رائے میں ایک نتیجۂ لازمی بلکہ خمیازہ اُس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنف مسرور نے اپنی عبارت اور طرز ادا کے اختیار کرنے میں شروع میں کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا دور ہم کو اپنے ہی زمانہ میں ملتا ہے جس میں لالہ سری رام صاحب کی مشہور و معروف تصنیف خمخانۂ جاوید ہے جس میں سلاست عبارت، روانی بیان اور متانت کے ساتھ بیحد کوشش کیگئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ اُن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے

اس تذکرہ کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اسکے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کا اور شعرالہند مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور سیرالمصنفین جناب تنہا (شاہدین کا تذکرہ) بھی ہرگز نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو ابتک پردۂ خفا میں تھیں معرض ظہور میں آگئیں۔

مگر غالباً غلط نہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہے اور انھیں وجوہات سے ان تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے چنانچہ تذکرہ خمخانۂ جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنی سے ادنی شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرہ گل رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے پرلو پر ہے اسکے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے باکمالوں کو اسمیں نظرانداز کردیا گیا ہے یا نظرانداز ہو گئے ہیں۔ شعرالہند بحیثیت مجموعی شعرا اردو کی ایک تاریخ ہے مگر ژولیدہ بیانی نے اسکو بھی حدود معین سے نکالدیا ہے سیرالمصنفین نثرنگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص نثر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادب اردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور گرانبہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

"ہسٹری آف اردو لٹریچر" جناب رام بابو صاحب سکسینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو انھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش جس کوشش زور مطالعہ اور وسعت نظر سے اسمیں کام لیا ہے اور سلوب بیان تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے شعرائے

شاعروں کے کلام کا توازن کر کے ان چھپی صحیح بیباکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ
اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ تلاش و تجسس کا یہ عالم ہے کہ ان
واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے۔ ایک ایک لفظ سے
ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اُٹھایا ہے اسکے ساتھ کہیں توازن وانصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔
قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز کیجئے زمانۂ حال میں جسقدر کتابیں زبان اُردو کی تحقیق یا اسکی
نظم و نثر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں اُنکے مصنفین زبان انگریزی سے کما حقہٗ
واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و
تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے
اُس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ پُرانے
رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا۔ موجودہ انگریزی دان
طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور اُنکی آنکھیں اُنھیں باتوں کو ڈھونڈھتی ہیں جو زبان انگریزی اور
دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت
اور دلچسپی میں ضرور ترقی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور
غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اسی
روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مورخین پروفیسر سینٹس بری وگاس وغیرہ
نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب و مخصوص اسلوب بیان کے
یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب اُن اصحاب کے واسطے بہت مفید ہو گئی جنھوں نے بی اے ایم اے
کی ڈگری یا آئی سی ایس کیواسطے ادب اردو لیا ہو جسقدر سوالات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جا سکتے
ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود

سوالات بنانے میں بھی بہت معین ہوگی - مگر چونکہ اردو دان طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لیے مخصوص تھی اسوجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اسکا ترجمہ کردیا جائے۔ مگر ترجمہ جسکو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں اسکے لیے میرے نزدیک اُسی مطالعہ اُسی تعمق نظر اُسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر انکی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اُردو ہے اور اردو ہی کے جامہ میں اُسکو پھر منتقل کرنا تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں - اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست لالہ بہادر کنور رگھو بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اُردو کی خدمت کرسکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلون سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اُردو ہی میں تھیں مگر قدیم تذکرہ نویسوں نے اُسکو فارسی میں بیان کیا ہے پھر انھیں کو اُردو میں بیان کیا اور پھر اُردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباین ہوگیا۔ اسمیں مصنف ایک حد تک معذور تھے لہٰذا ان کو اُردو میں دوبارہ پھر اُسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جسکی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوذہ کا اعادہ کرنا پڑا ہی تو اُن کے الفاظ کو نیا جامہ پہنانا پڑا ہی بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا مگر بعد میں انکی کسیقدر تفصیل ضروری تھی اُن کو بھی اسمیں بیان کیا گیا۔ اور اسمیں تحقیق و تنقیح

کما ینبغی کیگئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور وقیع نہ تھا اس لیے اصل کتاب میں اسطرف توجہ نہیں کیگئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔

کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اُردو کے لیے نقد و تبصرہ میں مساحمت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لیے اکثر اس بات کو نظرانداز نہیں کیا گیا ورنہ ظاہر ہے کہ گلشن بیخار میں نظیر اکبرآبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بےلوث ظاہر کردیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جسمیں وہ سب اساتذۂ دہلی معرض تحقیر میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیخار یعنی نواب مصطفے خان شیفتہ سے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح سے برہان قاطع دکھنی، اور قاطع برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بےپایان طوفان برپا کیا تھا اسکی ہیبت آواز آجتک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جسکے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے اس لئے اسمیں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئینگی جو اصل کتاب میں تھیں کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کردیا گیا ہے غرضکہ یہ ایک کوشش و کاوش ہے جو ارباب نظر کی خدمت میں ہدیۂ نیاز بنا کر پیش کیجاتی ہے اور نگاہ منتظر طغرای قبول کی متمنی ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اسکے امروزہ تمام حصہ

نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ یعنی زبان اُردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُسکا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اُس نے سرنگوں ہونا اور مٹ جانا۔ نظم کے ادوارِ مختلفہ اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں۔ موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام اصناف نظم پر روشنی۔ اُنکی ابتداء و انتہا کے تاریخی نقطۂ نظر انکشافات۔ نثر اُردو کے مشہور مصنفین اُسکی عہد بعہد کی ترقیاں اُنکی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور شارعین کا ذکر اور نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں غرضکہ سبھی کچھ ان اوراق پریشان میں موجود ہے۔ اُردوے جدید کی جو روش بعض ناعاقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اصولی طریقہ پر خواہ اُسکا کوئی بھی موجد اور ذمہ دار ہو۔ مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست، شیرینی، روانی بیان کا خاتمہ کرکے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنادیگی میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہوجائے اور نہ وہ اسقدر دشوار ہوجائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔

کتاب کا فائدہ اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اسکے آخر میں ایک مفصل انڈکس شامل کیا گیا ہے تاکہ ہر اُس چیز کو جسکا اسمیں ذکر ہے بآسانی ڈھونڈھ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسمیں بعض مشہور شعرا اور شاعروں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ہرچند کہ یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی معتد بہ اضافہ ہو۔ مگر جبکہ فی زمانا دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے اور انسائیکلوپیڈیا اپنے مشاہیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو ہمکو بھی مناسب معلوم ہوا کہ اسطرح ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے ہیں

اسی طرح انکے خد و خال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور شعرا کی تصاویر دیجاتیں مگر افسوس ہے کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدھ ملی بھی اسکا بھی اعتبار نہیں علی الخصوص سودا کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ادبی رسالہ میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اسی سے لی گئی ہے نہایت بھدی اور بھونڈی تصویر ہے اور ہرگز دل نہیں مانتا کہ میرزا رفیع سودا کی شبیہ ہوگی۔ بہرطور جسقدر عمدہ اور معتبر تصاویر بہم پہونچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں۔ اور اسکے واسطے ہم اپنے مکرم و محترم دوست منشی دیا نرائن صاحب نگم کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کئے اور خود مصنف صاحب اور مولوی عبد الباری صاحب آسی کے بھی شکرگزار ہیں جنکی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیجدیا جسمیں سے اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکریہ ادا کروں۔ سب سے پہلے میں اپنے مددگار اور دوست مولوی عبد الباری آسی کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھ کو اسکی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی۔ مجھ میں ایک سخت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں۔ یہ کتاب تمام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اس اعانت قلمی کا نتیجہ ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اگر ان کا سا کاتب مجھے نہ ملتا تو اسکا اتمام و اختتام دشوار تھا۔ مولوی جعفر علی صاحب مصحح مطبع کا بھی میں متشکر ہوں کہ انھوں نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے میرے ساتھ پروف پڑھے اور سپرنٹنڈنٹ مطبع یعنی بابو کیری کرو لس صاحب سیٹھ کا بھی شکریہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں دلچسپی لیکر کافی مدد دی۔

مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۲۹ع

# باب ۱

## زبانِ اُردو اور اُسکی اصل

**اُردو سے کیا مراد ہے**

عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اسکی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اُسمیں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اُسکی شاعری کی بحریں اور اُس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اسی غلطی کی بنا پر عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصۂ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان حامیانِ اُردو و طرفدارانِ ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز اُنکی استعداد قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبانِ اُردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ اُردو اُس ہندی بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں سے دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جسکا تعلق شورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جسکو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبانِ اُردو کی اصل و بنیاد سمجھی جا سکتی ہے

مگر جب "اردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صَرف ونحو محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُسمیں استعمال ہونا اِس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جسکی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بعد بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میر امن اور بعض اور قدیم اُردو نثاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو و نما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جسکو زبان ترکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور محاوروں کے قبول کر لینے کا مادہ اُس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اِس زمانہ میں انگریزی تقلید میں اُردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں مگر یہ لفظ ہماری رائے میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی گو اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دہلی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اُردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔

**اُردو اور ہندی کا تعلق**

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اُردو کا اصل ماخذ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جسکو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور سب ذیل بولیاں اُسکی شاخیں ہیں یعنی بانگارو، برج بھاشا، قنوجی اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اصل ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر اُنکی جگہ سنسکرت لفظ رکھدیے گئے۔ اسی اصل ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں مگر سچ پوچھیے تو اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے اگر کچھ ہے بھی تو نشو و نما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پلی اس لیے اُسمیں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی برخلاف ہندی کے کہ جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

**زبان و ادب اُردو اُسکی ابتدائی حالت**

شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔ بعد میں اُسمیں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اُسی قدر اُس میں فارسی اور عربی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدت کی چاشنی دینے کے لیے اُن کو بکثرت استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصل زبان سے بالکل اجنبی

اور اُس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جا سکتے تھے۔ اُردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین طرز بیان تخیل، تشبیہات، خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ نثر کا بھی یہی حال تھا یعنی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نثر کی جان تھی اُردو میں اُن کی پوری نقل کیجاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اردو پر اسقدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، اظہار خیالات، مضامین اور طرز ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ابتدائی شان اُس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

**اُردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب**

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتاً زبان فارسی جو اُن کی مادری زبان تھی ہندوستان کی دربار شاہی کی زبان بن گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اُسی کے طرز ادا اور محاورات وغیرہ کی متبع اور ناقل ہو گئی۔ لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اُس وقت کے لوگ بھی پرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات استعمال کرنے لگے دیسی زبان میں جو اب شرفا اور معزز شہری لوگوں سے چھوٹتی جاتی تھی اور اطراف شہر

جہالت میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رخ کیا اور اسکو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے مثلاً چند کوی کی پرتھی راج راسو کو دیکھیے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اسکا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لئے اسکو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی اُن کا پایۂ تخت ہو گیا اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لئے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسال آتے تھے اور مال غنیمت لیکر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط و ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور ان کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا کیونکہ فارسی کے زبان داں اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تغیر ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی جڑ مضبوط

ہو گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط ہوگئی اور اسکی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے کیونکہ وہ سننے میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زوردار تھے اور انکے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، اسکے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے ملتیں اور تقرب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتداءً ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے جب قدیم اہل انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "اینگلو سیکسن" کی بھی "نارمن فرینچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی پس جس طرح زبان انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں پائی جاتی ہیں وہی صورت اردو کی بھی سمجھنا چاہیئے۔

اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں مسلمان جب بحیثیت فاتح اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جا سکتے تھے اس لیے بجنسہٖ وہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام، مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو نرم نرم حسن و عشق کے افسانوں کے لئے نہایت موزوں تھی اس لیے لوگ ایسے موقعوں پہ فارسی الفاظ ہی بولنا پسند کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے ایسے [illegible] لفظوں کے سامنے پرانے دیسی الفاظ اور محاوروں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیے [illegible]

ان کو پنپنے ہی نہیں دیتا تھا۔ زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے۔ جب یونانی اور لاطینی علوم کا احیاء ہوا اور معارف ترقی ہوئی تو اُس زمانہ میں بھی ہوتے ہوتے عالمانہ لفظ بولنے کا فیشن ہو گیا تھا

بہرحال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آ سکے اور چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے ان کو خوش کرنے کے لیے اُنکی زبان سے زیادہ اخذ کیا بنسبت اسکے کہ اُن کے مالکوں نے اُنکی زبان سے فائدہ اُٹھایا۔

اظہار قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اُردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی جس کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا جنھوں نے بلاشک اُسکے ساتھ بہت کچھ کیا۔ اُنکی آغوش تربیت میں رہ کر اُردو کا نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا۔ نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور، صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سیکڑوں فقرے جو حرف ربط "بہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں شعر میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو دیسی مروجہ قواعد صرف و نحو سے بالکل خلاف تھے آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں نتیجہ ہوا کہ فارسی کے اثر سے اُردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود لیکن اسکا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اُردو کی ابتدا ہوئی تھی

بہت کچھ فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر — فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اُردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبان ڈچ اور فرنچ کے چلے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اس قدر دُھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔ پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اردو لغات میں معتد بہ اضافہ کیا۔ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالک مشرق میں گویا تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُنکی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں اُن کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے اُنھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں اُنکی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہو گئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس کو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی۔ سب سے زیادہ اثر بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح دراوڑی زبانیں مثلاً مرہٹی، اسامی، اور اڑیا بھی اُس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اُردو بھی اُس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اُسوقت پڑ رہا تھا جب دکھنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اُردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں۔ پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے ہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں اُن کو قبول

کر سکتی تھیں اسی ہیئت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کیے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے مسخ ہو کر داخل ہوئے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں ان ممالک میں رائج ہو گئے تھے، پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیائے طعام۔ اچار، اناناس۔ افوس (قسم انبہ) بسکٹ۔ کاجو۔ پمپفرے۔ (قسم مچھلی) پپیتا۔ تمباکو، ترنج، جاء۔ ساگو۔ گوبھی وغیرہ

از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ۔ الپین، الماری، ارغنون، بجرا، بالٹی، بوتل، پیپا، پستول، پریگ، چابی، صابون، کوچ، کپتان، کاربین، کارتوس، میز، تولیہ، کارد وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری۔ گرجا، کراس وغیرہ

لباس میں۔ سایہ، قمیص، کاج، اسپیٹ وغیرہ

متفرق الفاظ مثلاً انگریز، آیا، بمبا، پاگر (تنخواہ) پاوروٹی، چھاپہ، نیلام، مستری، کمرہ، روپیہ وغیرہ

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان میں کی اور ان کے نام بھی اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب شراب پرتگالی کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہے گی۔ انگریزی علم ادب نے اردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائیگا۔

لیکن ابتا اس موقع پر غور رتا دینا چاہیے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اُردو میں داخل کیے جنکی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہو گئے۔ ترجمہ کا بھی نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اسکی بدولت اُردو میں شامل ہو گئے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اُردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کو مالدار ہونا چاہیے اور ہر طرح کے الفاظ جو اسکی اصل سے میل کھاتے ہوں اسمیں ضرور داخل ہونے چاہییں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اسکی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

**نثر اور نظم کی زبان** ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اور نیز اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو نظم کی عبارت بہ نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں، یہی وجہ تھی کہ فارسی محاورات اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے۔ اگر اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ شروع میں مقفٰے عبارت بہت پسند کیجاتی تھی جس میں بیجد تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جسمیں ظہوری اور بیدل کی مرصع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پُرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی کے بعینہ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سرسید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا جبکہ مغربی

تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفی عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دور جدید میں نثر نگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ عملی دُنیا میں سیدھے سادے صاف اور زور دار الفاظ کی ضرورت ہے۔ اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستان نظم کی آبپاشی اب بھی چشمۂ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اُسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نثر کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پُرانی لفاظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کیجاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر اُنکی کثرت اور جا و بیجا استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشا پردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

**ادبی اُردو** تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جسکی وجہ اُنکی جدت عظمت اور شانداری ہے۔ ابتدا میں بیشک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُسوقت تک اس میں بھونڈا پن تھا۔ نہ اُسپر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت اُس میں تھی کہ

اُس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہو سکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جا سکے۔ اُسمیں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کے جذب کرنے کا مادہ موجود تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جو الفاظ اور بندشیں اُسکو ملتی گئیں وہ سب اُس میں شامل ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں پختگی اور صفائی آتی گئی۔ دور اول کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اُردو کا عنصر غالب ہو گیا اور غالب نے مغلوب کو جذب کر لیا۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اردو میں ملگئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے۔ بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش ہے کیونکہ یہی کثرت الفاظ جو اُردو کا مایۂ ناز ہیں اُسکو اتنا لوچدار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اُس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام

قدیم انگریز مؤرخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کرتے تھے۔ شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اُس کو "لنگوا اندوستانی کا" لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورخین اُس کو "مورز" کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے لفظ "ہندوستانی" زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروج ہو گیا۔ گو کہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے جبکہ مسٹر ٹیری نے سب پہلے اس کو استعمال کیا تھا "اُردوئے معلّٰی" کا معزز خطاب شاہجہان نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہو گئی تھی۔

لفظ ریختہ (یعنی وہ زبان جس میں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان ریختہ اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بادشاہوں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی فرق ہو جائے لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے ابتدا میں نظم کے واسطے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اُس زمانے میں بہت کم تھا میر اور مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔

| اُردو کا رسم الخط |

اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

| نظم اُردو |

نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسینٹ" کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علت کی آوازیں کھینچکر بڑھا بھی جاتی ہیں اور اُس کو "اشباع" کہتے ہیں۔ نظم اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے موجودہ بحریں اُنیس ہیں جن میں سے بعض عربی کے لیے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے اور اُن کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لیے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیے تھے اُن کی تکرار یا

تغیر تبدل سے مختلف بحریں قائم ہو گئی ہیں۔یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مادے سے بنتے ہیں اور انھیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحریں انھیں سے قائم ہیں تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن ۴۔بار بار رکنوں میں ردو بدل ہوتا ہے جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہیں تحریر شدہ حروف کے ساتھ اُن حرفوں کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے۔وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کیے جاتے۔الف ممدودہ شروع لفظ میں جب آتا ہے دو حرف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کیجاتی ہے "رُکن" کہتے ہیں جسکے معنی ستون کے ہیں جسپر عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے۔پورے شعر کو "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں۔نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اُردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ یہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں۔ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحور اور ردیف وقافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۱۰ سے ۱۲ تک گو کہ اسکی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔قصیدہ میں عموماً کسیکی مدح یا ہجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز یا فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵۔اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰ تک مگر اسکی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصہ

قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن۔ نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہموزن اور ہم قافیہ ہونے چاہییں۔ مطرف میں آخری الفاظ کے ہموزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ متوازن میں ہموزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ "تذکرہ" میں شعراٗ کے سوانح و حالات مختصراً بیان کیے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعۂ نظم کا نام ہے۔

# باب ۲

## ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور

نظم کا تقدم نثر پر اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادب اردو کے ساتھ

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقائے تہذیب انسانی میں جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے گو کہ ظاہراً نثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کیواسطے موزوں ہے

زبان اُردو کی دیوی اپنے سازِ طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی
کہ ادب اُردو جو در اصل ادبِ فارسی کا متبع اور ناقل ہے اُسکو اپنے پیشرو کی تقلید بہ نسبت نثر کے
نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری
زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے، اور چونکہ
اُردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُس کا ادب ہنوز عالمِ طفلی میں تھا قوتِ تخییل و اظہار
جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہٰذا جب
اسکی پیدائش کا وقت آیا تو وہ اپنے اُستادوں کے دماغوں سے شعرا کی طرح دفعتہً نکل آئی
اور اظہار خیالات و جذبات کے لئے چونکہ نثر عام طور پر نہیں پسند کیجاتی ہے۔ لہٰذا
متقدمین اُردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے۔

**سب سے پہلا اُردو شاعر**
**امیر خسرو دہلوی**

زبان اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دُھندلا نظر آتا ہے کہ
اُس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی
شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اُردو کا اِس دُھندلکے میں جو صاف طور پر
نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جنکی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر
کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج بیان نہیں۔ اِن کا لقب اسی شاعری کی مناسبت
سے "طوطیِ ہند" ہے اُنھوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ ادبی اغراض سے
استعمال کیے اور سب سے پہلے اُردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلی غزل اُردو بھی امیر خسرو
ہی کی طرف منسوب ہے مگر اُسکی ترکیب اس طرح ہے کہ اُس کا ایک مصرع فارسی اور

---

لہ ۔ یہ یونانی دیوتانی کیطرف اشارہ ہے جسیں مرقوم ہے کہ منروا جو یونانیوں میں عقل و علم اور جنگ
کی دیوی مانی جاتی تھی جیوپیٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعتاً پیدا ہوئی تھی ۔

ایک اُردو ہے اور بحر فارسی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکریاں، انملیاں، دوسخنے دوہرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں اُن کی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جس میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بمشکل اُردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو[۱] تیرھویں صدی عیسوی میں ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) میں پیدا ہوئے[۲] اور متعدد شاہانِ دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و محبوب خاص تھے جن سے اُن کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سُنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۱۳۲۵ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ بلبن اُن کی بڑی قدر کرتا تھا اور اُن کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں اور اُن کی کتاب "خالق باری" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے جسکو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اُردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اُسکے موجد و مخترع کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر پختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ اُن کا دور ابتدائی دور ہے اور گو اُس وقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آیندہ ترقیوں کی

[۱] فارسی میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جسکا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ اُردو میں کر دیا ہے مثلاً "سود لے مرغ تو گشت مارا"۔ گشت کے معنی اُردو میں مارا کے ہیں۔

[۲] مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت ۶۵۱ھ ہجری ہے۔

داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی ۔

**اُردو کی پختگی کا زمانہ** امیر خسرو کے زمانہ سے لیکر دکن کے شعرائے اُردو کے عہد تک بڑا فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اُس کے حقیقی نشو و نما اور مضبوطی کی کہی جاسکتی ہے ۔ زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت، لوچ، اور وسعت کی اسکو سخت ضرورت تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پردازی کی اغراض کے لئے اُسکے لغات میں معتدبہ اضافہ ہونا چاہیے تھا اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اُس نے اپنے آغوش محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی۔ چنانچہ ملک محمد جائسی (سنہ ۱۵۴۰ء) کی پدماوت جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (سنہ ۱۴۴۰ء لغایت سنہ ۱۵۱۸ء) کے بھجن اور بابا تُلسی داس (سنہ ۱۵۵۰ء لغایت سنہ ۱۶۲۴ء) کی تصانیف میں ایسے الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔

**ترویج عہد اکبری** زبان اُردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے اُنھیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہونچانے اور اُس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کوشش کی رفتار عہد اکبری میں بہت تیز تھی شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہو جائیں۔ چنانچہ وہ خود بھی کبھی دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے اہل دربار بھی اُسکی تتبع میں ہندی میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُس کے درباری شاعر سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے اور

عبدالرحیم خان خانخاناں دربار اکبری کا رُکن عظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصہ شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی یکجہتی اور اتحاد تھا اسوجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اُسی زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اُردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صیغۂ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پرتال میں اُن کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حاسبوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بُعد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اسکا حکم دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے واسطے بہت ضروری قرار پاگئی۔ کسی قسم کی ترقی اور دربار رسی بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دیدیا کہ صیغہ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں اُن کے لئے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ شاہجہاں کے عہد میں درجۂ تکمیل کو پہونچی اور اب زبان اس قابل ہوگئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے ترقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

**قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گولکنڈہ وبیجاپور**

امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اُردو کی نمود کیواسطے صبح کاذب کہنا بجا ہے جسکی صُبحِ صادق ہمارے نزدیک مُلکِ دکن

کے مطلع پر مسلمان شاہان بیجاپور و گولکنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود صاحبان علم و فضل اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱ - ۱۶۱۱ء)، سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ - ۱۶۲۵ء)، عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ - ۱۶۷۲ء)، ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲ - ۱۶۸۲ء) جو سنہ ۱۷۰۰ء میں قید میں مرا یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مربی اور قدرداں تھے۔ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکھنی میں شعر کہتے تھے جو اردو ہی کی ایک شاخ ہے جسکی تفصیل آگے آئے گی۔ ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸ - ۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی کی اور زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔ جس کا دیباچہ بزبان فارسی اس کے دربار کے مشہور شاعر و نثار ملا ظہوری ترشیزی متوفی سنہ ۱۶۱۶ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اردو نثاروں نے اسکی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا۔ جس کے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکھنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا ان کتابوں کی وقعت اسقدر ضرور ہے کہ وہ زبان ادب اردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں

ولی دکنی سنہ ۱۶۶۸ تا سنہ ۱۷۴۴ء

جب ولی کا نیرِ اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افق شاعری پر اُسوقت ضیا فگن تھے سب ماند پڑ گئے۔ ولی کو ریختہ کا موجد گویا اُردو کا چاسر خیال کرنا چاہیئے۔ اسی زمانہ میں اُردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا ولی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اُسی کو دیکھکر اور اپنے سامنے رکھکر اُسوقت کے تمام شعرائے دہلی نے ترقی کرنا شروع کی۔ ولی کا کلام نہایت صاف سادہ فصیح اور پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہوں سے پاک ہے تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جابجا ملے جلے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے

قدیم شعرائے دہلی
حاتم، آبرو، آرزو

دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے منتقل ہو کر دہلی میں آگیا اسوجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں متبع ولی کے پیدا ہو گئے جو اُن کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اُسی طرز پر کہتے تھے۔ اب اُردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اُسکی مدمقابل اور حریف بن گئی گو ابھی تک اُس میں وہ کہنگی اور پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اُس کی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اُردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جسکو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اُسی سے دل بہلاتے تھے سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اُس میں جان باقی تھی اور درباری

لہ چاسر زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر سنہ ۱۳۴۰ تا سنہ ۱۴۰۰ء اسکی مشہور تصنیف کنٹربری ٹیلس (کنٹربری کے قصے) کی زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اُردو کے کمزور اور نوخیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہزورِ سخن کا رپہلوان سے مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اُسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ قدیم شعرائے اُردو سب بڑے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

ولی کے متبع ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) ناجی مضمون، آبرو اور بہت سے اور شعرا پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کے آبا سمجھنا چاہیئے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف وسادہ اور تصنع وتکلف سے بہت کچھ پاک وصاف ہے نشست الفاظ میں بہت زورِ طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ ولی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں اُن کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحریں اُردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ اُن کے زورِ طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں اور اُنکی مشاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے۔ مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

> میر وسودا کا زمانہ۔ اس زمانہ کی ترقیاں، زبان اور شاعری میں اصلاحیں،

یہ زمانہ اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینتِ الفاظ اور جدتِ خیال سے آراستہ وپیراستہ ہو کر

دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ یہ میر اور سودا کا زمانہ ہے جو اُردو شاعری کے رکن رکین اور استادِ اعظم مانے جاتے ہیں یہ دونوں بزرگ اپنے حسن و ملاحت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کیوجہ سے اپنے تمام ہمعصر اور نیز ماسبق حریفوں پر گوئے سبقت لیگئے ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہونچ گئے۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت اور ضیا ان کے ہمعصر ہیں جو سب علاوہ اُردو کے نظم فارسی کے بھی اُستاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہٰذا وہ قدرتاً ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی اُن کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہوگئی جو ولی اور اُن کے ہمعصر شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنسہٖ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کرلیے۔ ان کا کلام اُردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے حسن و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور مؤثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ اِن کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لُغات کا خزانہ اِنھوں نے کھنگال ڈالا جسمیں سے صدہا جواہر ریزے منتخب کرکے زبان میں داخل کئے گئے ہیں۔ گل و بلبل اور قمری و شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اُردو میں بھی داخل ہوے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے۔ فن شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی نقائص اور معائب

سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بحروں میں کہی جانے لگیں جو اس سے بیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اُسی حد تک کہ اُن سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھُل مِل جاتے تھے اور بدنما نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوئے۔ مثلاً واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مثلث، مربع، مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لئے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن بیشتر سے مروّج تھے اُن میں بھی ترقی ہوئی۔ صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اِس زمانہ میں کم ہوگئی گو بعد کو پھر رائج ہوگئی۔ میر کو یہ صنعت کم پسند تھی مگر اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حُسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ مظہر اور اُن کے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ اُنھوں نے اُس میں بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آیندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور اُنھیں پر مبنی تھیں۔ اس عہد میں زبان اُردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اُس میں قوت، وسعت اور لوچ باحسن وجوہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آیندہ ترقی کا دروازہ کھُل گیا۔

انشا اور مصحفی کا دور
اُن کی خدمات زبان
اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور بعد کے شعرائے دہلی سے شروع ہوا۔ جس میں آثر، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، راسخ، بقا، حسرت، رنگین اور فراق مشہور زمانہ ہوے۔ اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور اُن کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کیے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک اُن کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی مگر اُن کے یک قلم نکالدیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچا ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اُردو کے قبضے میں ایک عرصہ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے ۔ قدیم اُردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لیے اُنھوں نے ہندی الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی اُن کو زبان سے خارج کردیا اور اُن کی جگہ پر فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیے۔ اِس کارروائی کو وہ لوگ اور نیز اُس زمانے کے مُسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے " زبان کی اصلاح اور پختگی" سے تعبیر کرتے ہیں اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پُرانے متروکات جو میر و سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور اُن کی جگہ جدید خوبصورت لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملادی گئیں۔ طرز عبارت میں کچھ فرق نہیں ہوا۔ مضامین میں بھی کوئی خاص جدت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس دَور کی شاعری اُس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حسن ظاہری کی تو عام طور پر

تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعرا نے کھلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں "معاملات" یا "معاملہ بندی" کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور رنگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی

یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اسکا مؤنث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفاء کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھانے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذب اور فحش ہوتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پرانے شعراء کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادری معصر ولی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہوگیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خاں رنگین اور اُن کے دوست انشا نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے۔ کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنف شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے

اوراب تقریباً متروک ہے۔

اس دور کے شاعر غزل کے اُستاد تھے اور مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے۔ لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر اپنا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہونچے جہاں دربار شاہی میں شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسن اور خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسن کی مشہور آفاق مثنوی "سحرالبیان"، جسکی روانی، سادگی، شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

**غالب اور ذوق کا زمانہ اور اُس کے خصوصیات**

اِس دور کی ابتدا شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، اور ظفر سے ہوتی ہے۔ اس میں وہ رہے سہے ہندی الفاظ بھی جو قدما سے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی اکثر تصانیف اِس زبان میں موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ شاہ نصیر کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبرآبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اُردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو اُستادوں کے قلم سے تو بُرے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اِس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی

ورنہ پھر اُردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اِسی فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلحاظ شاعری غالب سے ذہانت وطباعی میں کم ہیں مگر زبان پر اُن کی قدرت مسلّم ہے اور محاورات وامثال میں تو ضرب المثل ہیں۔ اُن کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے ظفر کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں وہ غالب وذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کے اُستاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اِس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحریں جو اب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں شعرا اپنا کمال فن دکھانے کے لیے مشکل قافیے اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحریں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت ومعنویت سے خالی ہوتا تھا۔ الغرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے۔ فارسی ترکیبیں کثرت داخل ہوگئیں خیالات میں جدّت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جسکا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

**شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اُس کے خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ۔**

ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ دِہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور

یہاں آکر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدردانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی اُمنگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور مشاقی نے شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا اور اُس میں طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کیں مختلف اصناف سخن پر قدرت حاصل ہو گئی۔ شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی۔ جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور اُن کی جگہ فارسی و عربی الفاظ نے لی۔ اسی طرح پُرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ترک کی گئیں۔

ناسخ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج انھی کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے واقعی اُن کو متروکات کا "ناسخ" کہنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک نیا رنگِ شاعری شروع ہوا جسکی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار۔ عبارت میں تعقید و تکلف۔ صنائع و بدائع اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت۔ فضول مبالغے۔ فرسودہ تشبیہیں۔ جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اسکے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے بحر، وزیر، صبا، سحر، رشک وغیرہ اپنے زمانہ کے

اُستاد مانے جاتے تھے قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر رہا یہاں تک کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی، سادگی ۔ نیچر کی جھلک، سوز و گداز، اور اثر پسند کیے جانے لگے ۔

ناسخ ہی کے ہمعصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا ۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں، ہر چند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور مؤثر ہے ۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ، چستی بندش، بلندی مضامین میں قدما کے متبع کہے جا سکتے ہیں ۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں ۔ بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے ۔ صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیے ۔ اِن دونوں پہلوانان سخن کے شاگردوں اور پیروؤں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے ۔

**مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ ۔**

مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے ۔ اُردو مرثیہ گوئی کو قدما نے نظر استحسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور اُن کے لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سر نو زندہ ہوئی اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ گو بکثرت پیدا ہونے لگے ۔ مرثیہ بہت پرانی چیز ہے عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے

اُردو میں اُس نے رواج پایا۔ قدیم شعرائے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر اُن کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی اصلی ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اُسمیں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر امرا اور رؤسا شیعہ مذہب رکھتے تھے جو اعتقاداً شہدائے کربلا کے مصائب پر گریہ و بکا اور اظہار غم و الم کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانۂ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہوگیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اس غم و الم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پُرزور اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ اسی وجہ سے فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دَور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پُراثر اور رقت خیز کلام سُناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت مؤثر اور قدرتی شاعری کا پرتو ہے۔ ان دونوں بزرگواروں کا کلام اُردو شاعری کے سر کا تاج ہے۔ انکی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور اُن کے زمانہ کی بداخلاقیوں سے بالکل پاک ہے۔ قصائد کی سی بیکار لفاظی اور دوراز کار مُبالغے اس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت جس کو سماں باندھنا کہتے ہیں اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو مؤثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اُردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیے۔

مابعد کے شعرا
امیرؔ و داغؔ
کا زمانہ۔

معزولی سلطان عالم واجد علی شاہ اور زمانۂ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثل امیرؔ، داغؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر

اسلامی ریاستوں میں چلے گئے۔ بعض نے رامپور اور حیدرآباد کا رُخ کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اُردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدما کے متبع تھے۔ دربار میں اور رُوسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ غزلیں، رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیش رووں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی بیساختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندی مضامین کم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے اُستاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔ اس دَور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

| جدید رنگ۔ آزاد اور حالی کا زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ۔ |
|---|

زمانۂ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے رُکن رکین آزاد، سرور، اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پُرانی قیود اور قواعد کی جکڑبندیوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا میدان شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی، بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو اُنھوں نے شروع کیا اور اُنہی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ

اور نیچرل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانۂ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں
اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے
نظم اُردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آیندہ ترقی کے
واسطے نئے راستے کھول دیے۔

**نثر اُردو**
**فورٹ ولیم کالج کلکتہ**

جدید نثر اُردو کی ابتدا اُنیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ اُنھوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط وضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے قیام کے پیشتر بھی نثر اُردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصّے کہانیاں تھیں اور کچی اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف ونحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا۔ "دہ مجلس" اور "نو طرز مرصّع" اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلّف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کیے گئے تھے سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امّن، حفیظ الدین احمد، مظہر علی ولا، اکرام علی، اور مرزا علی لُطف وغیرہ ہیں جنکی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ اِن کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی

اور سنسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی تک نثر اُردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانۂ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں اُن کا بھی زیادہ تر دارو مدار اُنھیں پر ہے "ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اُردو) سرکاری زبان ہوگئی اور یہ استعداد اُس کو حاصل ہوگئی کہ بجائے مروّجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے"۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُردو لغات اور صرف ونحو کی کتابیں بھی اِن کے زمانہ میں تیّار ہوئیں ۔

**نثر مقفّٰی**
**رجب علی بیگ سرور**

سادہ نثر کے مقابلہ میں جسکی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہوئی تھی وہ نثر مقفّٰی ہے جو ظہوری اور بیدل کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اسکی عبارت مقفّٰی اور جملے بالکل نپے تُلے ہوتے تھے صنائع بدائع استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دِقّت واقع ہوتی تھی، اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دِقّت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفّٰی عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبول عام رہی۔ خطوط تک اِسی قسم کی مُرصّع اور باتکلّف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے، تمہیدیں، تقریظیں، خواہ بزبانِ فارسی یا اُردو سب اسی قسم کی رنگیں عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اِس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ اُن کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب"، جس طرح اپنی انشا پردازی میں مشہور ہے اُسی طرح لکھنؤ کی اُس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو بہو تصویر ہے ۔

| |
|---|
| ...یائے لطافت |

انشا اور قتیل کی "دریائے لطافت" کو گویا فارسی اور اُردو کا مجموعہ
...نا چاہیئے۔ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اُردو
...پہلی کتاب ہے جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اُس میں یہ بھی خوبی
ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا
...ثر زبان اُردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں
اور جماعتوں میں مروج تھیں ان سب کے نمونے بھی اُس میں بکثرت موجود ہیں۔

| |
|---|
| اُردوئے معلّٰی اور عود ہندی |

ایک بہت بڑی شخصیت نثر اُردو کی تاریخ میں مرزا غالب
کی ہے ان کی مشہور تصانیف "اُردوئے معلّٰی" اور "عود ہندی" ایک دلچسپ
مجموعہ اُردو خطوط کا ہیں جسکی عبارت نہایت سادہ سلیس، بے تکلف اور نہایت
دلآویز ہے اِن میں ایک خاص قسم کی پُر لطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے
دونوں کتابیں نثر اُردو کی سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں مُصنّف کے
ذاتی حالات کی طرف جابجا جو اشارے ہیں اُن کو پڑھ کر دل بہت محظوظ ہوتا ہے
غالب کے طرز نے اُردو کی نثر نگاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح
پھونکی جس کا اثر زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں پر بھی بہت کچھ پڑا۔ غالب بھی اپنے زمانہ کے
مروجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ انکی اکثر تحریروں میں وہی پُرانے رنگ کی مُقفّٰی
اور مسجع عبارت پائی جاتی ہے جو اُن کے زمانہ میں عام تھی۔

| |
|---|
| عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر۔ |

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی نثر اُردو پر ایک خاص
اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر اُن پادریوں نے جو
سیرام پور واقع بنگال میں قیام گزیں تھے بائبل کا ترجمہ مُلک کی دیسی زبانوں میں

کرکے اُنکی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اُردو میں شایع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ نویسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اِسی زمانہ سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۴ء تک شائع ہوے وہ زیادہ تر اُردو ہی میں ہوے تھے۔

سر سید اور اُن کے رفقائے کار کا زرین عہد

نثر اُردو کی ترقی کا زرین عہد اُنیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیئے جس میں سر سید اور اُن کی جماعت کے لوگوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اِس زمانے میں جسقدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مُسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندؤں کے درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اُردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پرزور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گوکہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اُس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو نثر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اصلاحیں ۱۸۲۰ء لغایت ۱۸۳۱ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا چاہتے تھے اُن کے اوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبان اُردو میں ۱۸۰۳ء میں شایع ہوا۔ جو اصلاحیں کہ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں اُن کی ترقی نمایاں طور پر سر سید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جنکی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی، جریدہ نگاری، غرضکہ ہر صنف و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں

زبان اُردو کو اتنا فائدہ پہونچا اور وہ اسقدر مالا مال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سر سید مرحوم ایک ایسے طرزِ تحریر کے موجد ہوے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورۂ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ اُن کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اُس وقت کے دیگر مشہور جرایدمیں چھپے ہیں ہزارہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سر سید مرحوم کے رفقاے کار نے، جن کو زبان اُردو کا نورتن سمجھنا چاہیئے زبان اور ادب اُردو کے ساتھ احسان عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹکل مضامین و لکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جنمیں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہونچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جادو نگاری جس کا انداز سب سے جدا اور ایک خاص رنگ ہے) درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانۂ اُردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر۔ چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری زبان قرار دیگئی۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اُردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات اور بڑھ گئی اور مختلف اصناف سخن اُس میں داخل ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی، قدیم و جدید

ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور اُن کی نشر و اشاعت آسان ہوگئی۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اُس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اُس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

**ناول نویسی کی ابتدا** افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اسکی تفصیل آیندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کیگئی ہے۔ زمانۂ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بین مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اُردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا فخر باحسن وجوہ حاصل ہوگیا۔

**اُردو ڈراما** یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اسکا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی پختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کریکٹر ناکمل اُن کے پلاٹ اکثر ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں صرف لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں۔ شیکسپیر اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہوگئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال اُن میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہوگیا ہے۔ اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے۔

# باب ۳

## اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے

اُردو شاعری دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اُس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودا جڑ پکڑ گیا اور اِس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کیے اور یہ سب چیزیں بلحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اُردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہوگئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایہ ناز ہوگئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جنکی رفتار تو ضرور سست تھی مگر ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ ازبس ضروری تھے۔ مثال کے لیے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کرکے معراج ترقی حاصل کی۔ اُردو میں لسی لکی کی وجہ سے وہی پُرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں بکثرت پائے جاتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا دفعتاً سنگ بنیاد بن گئے۔ شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ

وتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صائب حافظ نظیری اور بیدل وغیرہ کی تقلید کو پنا فخر سمجھتے ہیں۔

نقلید کے بُرے نتائج

اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اُردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمین ہندوستان ان مضامین سے ناآشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم و اسفندیار کی بہادری، مانی اور بہزاد کی نقاشی، جیحوں و سیحون کی طغیانی، بیستون اور الوند کی بلندی وغیرہ وغیرہ یا جانوروں میں بلبل، درختوں میں سنبل وغیرہ یہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جنکو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری

اردو شاعری محض نقالی ہے

واقعیت سے ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی۔ ہندوستانی بادشاہوں کے عدل کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اُن کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے سخاوت میں وہ حاتم بتائے جاتے ہیں۔ حرماں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور اُنکی معشوقہ ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہکن خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لئے سرو و شمشاد۔ آنکھوں کے واسطے نرگس، زلف کے لئے سنبل۔ بیرحمی اور سفاکی کے لئے ترک، گُل کی عاشق بُلبُل، سرو کی دلدادہ فاختہ، بادصبا کی اٹکھیلیاں، چاند کو دیکھکر کتاں کا پارہ پارہ ہونا یہ سب فارسی سرمایہ اُردو کے واسطے مخصوص بلکہ اُسکی ملک ہو گیا اور ان کی وہ بھرمار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی اُس کو اپنے مُلک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی

قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا مثلاً ہندوستان کی بہار اسکا موسم برسات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اُس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتا نہیں ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرما، موسم بہار، ہمالیہ کی سر بفلک برف زار چوٹیاں، گنگا اور جمنا کے خوبصورت گھاٹ، ان کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی سر چارلس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں "اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور مضمون بار بار دُہراتی ہے جن کو خود اساتذۂ فارس نے بارہا پامال کیا ہے۔ مضامین اور الفاظ دونوں ابتداسے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں۔ اُن میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کمی کی وجہ سے اُن کو ایک نہایت عظیم الشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی۔ جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کہنا ہو اور اُس کو اُس سے پیشتر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہہ گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ پس یہی اسلوب یا بالفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعر اُردو شاعری کا مایۂ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ دلچسپ مبالغے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔

**اُردو شاعری صرف رسمی رہ گئی** اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی

کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں جو بارہا لکھی جا چکی ہیں پھر دہرائی جاتی ہیں۔ آئینۂ فطرت کے مشاہدہ کا آئیں کہیں پتہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیام ہوتا ہے۔ پُرانے شعرا کی کشکولیں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاعری محض نپی تلی چیز ہوگئی نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ ہر شاعر اپنے کلام میں اُسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنعات اور بدمزگی سے بھرا ہوا ہے۔

قافیہ پیمائی فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی ایک قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدت ہوئی کہ یورپ کی شاعری اس بار گراں سے سبکدوشی حاصل کرکے آزاد ہوگئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے غرضکہ انھیں قیود سے اُردو شعرا کے تمام دواوین بھرے پڑے ہیں اب اس بدمزگی کا احساس خود ہمارے شعرا کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلاف نیچر مضامین علاوہ نقائص مذکورۂ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لیے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کرکے اُس کے گھونگروالے بال اُسکی زلفیں اُسکا سبزۂ خط اُسکی بھیگی مسیں اُس کے خد و خال اس لطف سے بیان کیے جاتے ہیں

کہ جسکی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس ڈگ کو ہمارے قدیم شعرائے اردو نے شروع کیا جس کا تتبع آجتک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اسطرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اُس کا خیالی معشوق اُس کے جذبات احترام نہیں کرتا برخلاف اس کے ہمارے اُردو شعرا بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہمجنس کے لیے کرتے ہیں اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں بلندی اور رفعت پیدا کرتی ہے۔ بخلاف اسکے اُردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنان بازاری کے حسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی سراسر پیرو ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری اور زبان کو پھیلنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے اُردو شاعری کو محض تفنن طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعرگوئی سے اُن کو فرصت ہوئی تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لئے اس میں بھی صرف کردیا۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں زبانوں کی برکتوں سے منتفع نہو سکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور درباری زبان تھی اور اُس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی لہذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ

اُس کے مقابلہ میں اُن کو بھدے اور اجنبی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کردیئے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت گرم تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انھیں وجوہ سے زمانۂ قدیم میں اُردو کی بے قیدی تھی۔ چنانچہ متقدمین اساتذۂ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو ہیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

معشوق کی تانیث کا اظہار

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اُسکی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اُسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت و خون تک نوبت پہونچی، لہٰذا اس خرابی کے دُور کرنے کے لیے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کیئے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کے کُھلم کُھلا نام لینے کو ممنوع قرار دیا جسکی وجہ سے یا تو اُن کے واسطے کسی مشہور معشوقۂ سلف کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغۂ تذکیر و تانیث میں فرق نہ تھا اسی وجہ سے شاید یہ صورت اَبتری ظاہر ہوئی۔ یہ عذر بارد فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے۔ مگر اُردو میں جس میں کہ افعال و اسماء سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کے

ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرقۂ اناث ہوتا ہے جسمیں حقیقی معشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھیے تو تہذیبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں پس لامحالہ جس حسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا

**اصناف سخن** اردو شاعری میں اصناف ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے :-

غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ، وغیرہ۔

**غزل اور اسکا رنگ** ان میں سب سے مشہور صنف شاعری غزل ہے جسکا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرون وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی۔ بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے روایات جنھوں نے ادب ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

**تصوف** تمام قدیمی شعرائے اُردو صوفی تھے اور اُن بزرگوں کی اولاد میں تھے جو مجاہدین اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاق تصوف اُن کے اسلاف سے ورثتاً چلا آتا تھا۔ اور لوگ اُن کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعداللہ گلشن کے

حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے جو ہندوستان میں ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمونؔ گو ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دنیا چھوڑ کر فقیر ہوگئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولت فقر سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن میر۔ سودا اور اسی طرح ان کے ہمعصروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔

فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے مملو تھی لہذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اردو نے منجملہ اور چیزوں کے اس میں بھی اُنکی پیروی کی۔ تقدس، ریاضت نفس، ترک ماسوی اللہ، دنیاوی نمایش اور ریاکاری سے اجتناب، تعیش اور حصول دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لیے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزلت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کردینا۔ ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیے۔ شعرائے صوفیہ حسن مجازی کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اُسکو حسن حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انھیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است — کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انھیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

**عاشقانہ** غزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی عیش پرستی

و فارسی شاعری کے تتبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے انگریزی میں اگر اس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سانٹ ہے۔ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سانٹ میں ما بہ الامتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے اور سانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں۔ اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور اسی وجہ سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوت صرف کرکے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے۔ جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے راز و نیاز، وحشت و جنون، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے؛ عاشقانہ شاعری دنیا کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے۔ کیونکہ عشق ایک فطرتی جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان سے ہوتا ہے تصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطریں پیشتر بیان کیا گیا۔

**اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر**

اُردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دلعزیز رہی اور اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں اُسکی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلی، حیدرآباد، لکھنؤ، اور رامپور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے

اُردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعرا کو اُن کی جانکاہی کے صلہ میں انعام واکرام خوب دیا گیا اور اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ معنائین شاعری محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعرا کو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔ دلّی اور لکھنؤ کی سلطنت کا مِٹ جانا اُردو شاعری کے زوال یا کم از کم اُس کے ضعف کا خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا اس وجہ سے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں خود تعیّش کے جذبات موجود تھے۔ اِس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اُس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصّہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ اُن لوگوں کو خوش کرکے شعرا کو اپنی کاربرآری کرنا ہوتی تھی اسی لئے وہ اِن دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ[ل] کے یہ دونوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ؎

اپنے رنگ عیش و عشرت کے لیے سب بادشاہ ؛ شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام

تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں پیش کرتے ہیں مدح ؛ لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابندِ دام

---

ل سروالٹر اسکاٹ گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناولسٹ گزرا ہے اُس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور اُن کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اُسکی نیچرل بیانیہ شاعری زبان انگریزی میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اُس کے وطن اصلی یعنی اسکاٹ لینڈ میں اُسکی اسقدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اُس کے کسی ناول یا کیرکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے ۱۲

اسی درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ بُرا نتیجہ ہوا کہ ہماری اُردو شاعری سے وہ تنوع پرکاری، وسعت، اور جدت مفقود ہو گئی جو دُنیائے شاعری کی جان ہے۔

دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی۔

اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اُردو میں برائنٹ[1]، ہوٹیر[2] اور ٹامسن[3] کی طرح کے شعرا کا پتہ نہیں اور نہ ورڈسورتھ[4] کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اُردو شاعری میں

---

[1] برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا ہومر کی الیڈ اور اڈیسی کا منظوم ترجمہ اس نے کیا ہے۔

[2] ہوٹیر یہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے اسکا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسنے اپنی پُرزور نظموں کے ذریعہ سے انسداد غلامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اس کو وہاں انسداد غلامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں۔

[3] ٹامسن (۱۷۰۰ء لغایت ۱۷۴۸ء) انگلستان کا خوشگو نیچرل شاعر ہے اسکا مجموعۂ نظم موسوم بہ سیزنس (موسم) مشہور ہے جسمیں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ چند ڈرامے بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اسکی دیگر تصانیف میں "رول برطانیہ" اور "کیسل آف انڈولنس" بہت مشہور ہیں۔

[4] ولیم ورڈسورتھ (۱۷۷۰ء لغایت ۱۸۵۰ء) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا اُن لوگوں میں شمار ہے جنکو انگریزی میں "لیک پوئٹ" یعنی جھیل کے شعرا کہتے ہیں اس وجہ سے کہ ورڈسورتھ اور اسکی بہن ڈورتھی اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گراسمیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے۔ ورڈسورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جائرانڈسٹ" کہلاتے تھے بہت ہمدردی تھی مگر جب نپولین نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اسکی ہمدردی اُس جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی۔ ورڈسورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے اسکی فلسفیانہ نظم رکلوس (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے اُس کے علاوہ ایکسکرشن (گلگشت) اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل بر فرائض انسانی) اوڈ انٹمیشنس آف امارٹلٹی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ کولرج کا قول ہے کہ ورڈسورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور اُن میں وہ وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں، دوسری بڑی خصوصیت اسکی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور اُن کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ ورڈسورتھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی اُستاد تھا۔ سودے کے بعد خطاب ملک الشعرائی اسی کو ملا تھا۔

اصلی قدرتی مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا لہلہاتے کھیت۔ گاتی ہوئی چڑیاں۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گوکہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں بلبل و گل قمری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعراے اُردو کے سرود میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہانتک کہ بے سُرا ہو جاتا ہے۔ سمندر کی نظمیں، آزادی کے راگ، حسن کی صحیح تصویریں، اُردو شاعری میں نہیں ہیں وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اور اہل دربار پسند کرتے تھے مثلاً شراب وکباب، رقیبوں کے شکوہ وشکایات، عاشقوں کی حرماں نصیبی، فلک کے جور وستم، تقدیر کی گردشیں بکثرت ہیں۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور اُن کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنف جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی۔

**اُردو شاعری حزن ویاس کی شاعری ہے۔**

کُل مشرقی شاعری جس میں اُردو کی شاعری بھی داخل ہے حزن ویاس کے مضامین سے مملو ہے ایک یورپین نقاد کی راے ہے کہ اہل مشرق اپنی طبیعت کی اُفتاد سے افسردہ خاطر پاسلر سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوے ہیں۔ دُنیائے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں اُنکی زندگی میں زیادہ تر حُزن ویاس درماندگی و بیچارگی زندگی سے تنفر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے اسی دُنیا کی بیزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادے کے بھی مذہب اور تصوف کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دُعائیں مانگنا تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوت ارادی کو بالکل معطل

و بیکار سمجھنا زمانہ اور آسمان کی شکوہ و شکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورۂ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو اُن کی فطری حزن و یاس کی رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اختر سعادت و اقبال غروب ہوگیا۔ اور اُن کی گزشتہ عظمت و جبروت کے واقعات خواب و خیال ہو گئے" اُردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براؤننگ[1] بہت کم ہیں مگر کہا جا سکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعرا کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و اثر پیدا ہو گیا ہے جسکی وجہ سے اُن کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔

**قصائد** قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذۂ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا ذوق اور امیر وغیرہ ہیں۔ قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ

---

[1] رابرٹ براؤننگ (۱۸۱۲ء لغایت ۱۸۸۹ء) دور وکٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ اُنیسویں صدی یعنے ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں جسکو انگریزی شاعری کا دور متأخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیئے تین نامور شاعر گزرے ہیں لارڈ ٹینیسن، سوئن برن اور براؤننگ اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے براؤننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ۔ گو عبارت میں کسیقدر پیچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات اسمیں یہ تھی کہ اُسکی بیوی بھی نہایت مشہور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہمعصر شعرا ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں چنانچہ براؤننگ کی مشہور کتاب سارڈلو جب نکلی تو اُس کے دوست ٹینیسن نے دیکھ کر کہا کہ میں اُسکے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارڈلو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

اسی وجہ سے اسمیں شکوہ الفاظ اور علو مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے - وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں مبالغے وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا ممدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون وزبان اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مشکل بحریں - سخت قوافی قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں۔ اکثر قصاید صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں -

**مثنوی** شعراء اُردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے اسمیں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کیجاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف بہ ایپک اور ڈراما ہیں اُردو میں صنف مثنوی اُن کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں مثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے اُردو کے مشہور مثنوی نویس میر۔ میر حسن۔ مومن خاں نسیم۔ قلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یوپی مین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے "مثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اُس کے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے ہر چند کہ اشخاص قصہ کے نام بدل دیے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پرانا ہوتا ہے۔ جدت صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشائے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں بدمزگی کے ساتھ بار بار دہرائے جاتے ہیں "

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے کہ مثنوی میں نہ تو کیرکٹر نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں اُن کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے۔ اُردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدمیہ کی پابند ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور سکندر نامۂ نظامی کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست چستی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

**مراثی** مراثی ادب اُردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب دکھائے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کیجاتی پھر بھی معرکۂ کارزار، مبارزین کی جانبازی، صبح اور شام کا سماں، جنگلوں اور میدانوں کے منظر دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے، الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچ دئے گئے ہیں۔ پُرزور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے اسکا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آیندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

**قطعہ اور رباعی** ان اصناف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں لکھی ہیں جن میں انیسؔ اور دبیرؔ اور حالیؔ کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اُستاد و شاگرد کا تعلق — اُستاد اور شاگرد کا تعلق ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام اُستاد کو دکھالیا جاتا ہے اور شعرا سے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعدلی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرائے اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں شاگرد عموماً اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں اُستاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طبّاعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری وہی رسمی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرۂ اتباع سے علحدہ ہوکر شہرت حاصل کرلیتا ہے۔

مشاعرے — مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص — شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کرلیتا ہے جس کو تخلّص کہتے ہیں بعض اوقات اُستاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات — باوجود اُن نقائص کے جو اوپر بیان ہوئے اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اسکے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے وہ عشق میں شرابور ہے نغمہائے غم عشق کی ناکامیاں۔ حسرت و ارمان۔ ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کیا بلکہ دُنیا کے علم ادب سے

علو خیال، نزاکت الفاظ، موسیقیت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ
کرسکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے
مگر یہی حال دنیا بھر کی شاعری کا ہے اُردو کی نظم و نثر کو وجود میں آئے ہوئے
ابھی بہت عرصہ نہیں گذرا مگر زمانۂ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا
ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی
نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع
پرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہرحال
اردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کے
قابل اور با اثر لوگ اُس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

# باب ۴

## قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایانِ دکن کے
دربار میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے
بہتر ہوگا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مُراد ہے اور اُس میں اور زبان
اُردو میں کیا فرق ہے۔

**دکھنی کیا چیز ہے** دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان
دکن بولتے ہیں۔ اُردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر

اُس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اُس میں بعض خصوصیتیں ہیں جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُسوقت اُس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہو گئے جو اب ادب اردو سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل اطراف و جوانب کی زبانوں یعنی مرہٹی۔ تامل، اور تلنگی سے ہوا تو اُس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آگیا۔ مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی کے قبل حرف (نے) استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے "مجھ کو" کے "میرے کو" بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کی چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہونچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں اُن میں سے اکثر متروک ہو گئیں۔ بنظر بریں دکھنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اُردو سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اُس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشو و نما پائی اور ولی اور اُس زمانہ کے مشہور شعرا کی کوشش سے اُس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

**زبان دکھنی کی ابتدا** ملک دکن کی فتح خلجیوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاءالدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دو مرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلۂ آمد و رفت

جاری رہا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہو گئی چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے
"چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند۔
بادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بتعمیر دولت آباد بگماشت و مادر خود مخدومہ
جہاں را با سائر حرم ہائے امرا و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از
مردم دہلی را کہ بہ آب و ہوائے آنجا خو گرفتہ بودند بحال خود نگزاشتہ طرا بدولت آباد
فرستاد و دہلی بنوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال و روباہ و جانوران
صحرائی بگوش نمی رسید"۔ مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے
ہو گئے۔ اور دِلّی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث
آب و ہوا کے اثرات، زبانوں کے اختلاط، اور مقامی باشندوں کے ساتھ
ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دلّی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے
اس میں نمایاں تغیر ہو گیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتد بہ فرق معلوم
ہونے لگا۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب

اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے کیا اسباب ہوسے بہت دلچسپ ہے قرین قیاس
یہ تھا کہ اُسکی نشو و نما دلّی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا۔ مگر بجاے اس کے ہم
دیکھتے ہیں کہ قدیم شعراے اُردو کا گہوارہ دلّی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے
اسکی کیا وجہ ہے۔ اس ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کیگئی ہے
اس کے صحیح جواب کے لئے ایک اہم واقعۂ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے
سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلا تھا

جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شگون نیک کیواسطے اپنے گرو کا نام تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیر مال بھی مقرر کیا۔ تاریخ فرشتہ[۱] میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی اُس سے قبل برہمن لوگ معاملات ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اُن کی زندگی امور مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے"۔ ہندوؤں کے صیغہ مال میں تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیز ان دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا شروع کیا اور اُس کے حکم سے ملکی حسابات جو اب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے"[۲]۔ اس سے دیسی زبان کو بڑی تقویت پہونچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہوگئی اور اُس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور برسر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی۔ کبھی ایک مسلمان حاکم اُن سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف۔ بعض اوقات چند

---

۱؎ دیکھو تاریخ فرشتہ ترجمہ مسٹر برگ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲

۲؎ تاریخ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۸۰

مسلمان حکمراں کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اٹھاتی رہی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی یہاں تک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اُس کا خاتمہ کر دیا[1]" باہمی ارتباط اور محبت و یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور اُمرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مُسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظامِ ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا دخیل ہونا رواداری کی پالسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور بہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی بہ نسبت زیادہ موقعے حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح اور بہبود مفقود تھی۔ پس مختصراً ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط، مسلمان فرمانروایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا

---

[1] دیکھو تاریخ دکن مصنفۂ مسٹر گریبل جلد اصفحہ ۲۹۴ -

یہ سب اسباب مِل کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کرکے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ اس کے علاوہ مُلکِ دکن میں اکثر بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر قدمائے اُردو صوفی منش اشخاص تھے اور اُن سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشو و نما کا کچھ حال تو معلوم ہوگیا مگر اُس زمانہ کے شعرا کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے تذکروں میں صرف بعض شعرا کے نام مِلتے ہیں اور اُن کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اِس پر کافی روشنی پڑے گی۔

**شاہان بہمنی کا زمانہ سنہ ۷۴۸ غایت ۹۳۲ھ**

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور اُن کے مؤلف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۷۹۵ھ) خواجہ سید گیسو دراز۔ شاہ میرانجی، مولانا وجہی۔ اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثّار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصۂ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد
۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء

سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں اس زمانہ میں دکھنی زبان کو بہت ترقی ہوئی ہندو رانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں دیسی زبان کو اور بھی تقویت پہونچی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبوجی کے نام سے مشہور تھیں مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدردانِ فن مہذب اور قابل بادشاہ تھے شعرا کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اردو کو دکن میں دکھنی کہتے ہیں اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف و جوانب میں تلنگی مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکھنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی دربار گولکنڈہ میں اس وقت کے شعرا اور اُدبا کا مجمع تھا جن میں مندرجۂ ذیل شعرا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شعور، بیچارہ، طالب، مومن،

سلطان محمد قلی قطب شاہ
۱۵۸۰ء تا نہایت ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہونچ گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ

کی وفات پر جو ۱۵۸۰ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ۱۵۸۱ء میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے ساتھ صلح کی اور اپنی بہن کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا۔ گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدر آباد کے نام سے موسوم کیا جو موجودہ فرمانروائے دکن کا مشہور دارالسلطنت ہے۔ قطب شاہ کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ فن تعمیر سے بھی اُن کو دلچسپی تھی دو مشہور عمارتیں مشہور بہ خداداد محل اور بارگاہ خسروی تعمیر کرائیں۔ اُن کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال اور اُستادان فن عرب و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قدردانی کا حال سُنکر آتے تھے اور اُن کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا جبکہ علما و شعرا میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق تھا چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ دیگر باکمالوں کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد مومن استر آبادی اور میر جملہ تھے۔ قطب شاہ کا مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت میں اہل دربار میں منعقد کراتے تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے اس عہد میں کہے گئے۔ علاوہ قدردان فن ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر تھے چنانچہ اُن کا کلام بزبان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک ضخیم کلیات کی صورت میں جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی میں قطب شاہ

اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے ان کی کلیات میں حسب ذیل اصناف سخن موجود ہیں مثنویاں قصیدے۔ ترجیع بند۔ مراثی بزبان فارسی و دکھنی اور رباعیات۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ سادگی اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبرآبادی کے زمانہ میں تکمیل کو پہونچی۔ اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت کے رسم ورواج ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی دوالی عید بقرعید بسنت وغیرہ۔ بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور منقبت میں ہیں۔ معرکۂ کربلا کے مؤثر مراثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اُردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ اُن کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر اُن کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی مثنویاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جاسکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جاسکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ اُنھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تتبع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا

اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین
کے اُن کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے اور
بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی اُنھوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے
متبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے
ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی استعارے اور تشبیہیں، مہند فارسی الفاظ،
خدا کی تعریف ٹھیٹ بھاشا میں، ہندو سورماؤں اور بہادروں اور ہندوستان
کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے، جو ہندی
شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں
معشوق سے طریقۂ خطاب جو بعد میں اُلٹ گیا اُن کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا
ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ قواعد نظم
الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین، تشبیہات اکثر اُن کے کلام میں موجود
ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اُسی طرح
استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں، عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر
صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو
اُس میں کوئی لطف نہیں آتا اس لئے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا
مگر جب نظر تحقیق وسیع ہو گی تو اُن کے کلام کی قدر کی جائیگی۔ مختصراً یہ کہ قلی قطب شاہ
اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اُردو کو اس
وسیع کیا کہ آیندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اُنھوں نے ایک ایسے
ادب شعری کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر و سودا انیس و دبیر ذوق

غالب وغیرہ ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔

| | |
|---|---|
| دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا | تمنن کی مرادن کے بھرے جام دویگا |
| کرتے ہیں دعوے شعر کا سب اپنی طبع سوں | بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا |

**سلطان محمد قطب شاہ**
**۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۲۵ء**

سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے اُن کی ولادت گولکنڈہ میں ۱۵۹۱ء میں ہوئی اور اُن کی شادی اپنی چچا زاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت متشرع اور پابند مذہب سنی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ منجملہ دیگر تعمیرات کے آٹھی محل۔ جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد۔ محمدی محل، دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نثر فارسی و اُردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں ایک فارسی اور ایک دکنی۔ جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے ہیں۔ اِسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہوگیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انکا تخلص اُردو کلام کیواسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ اِن کے دونوں دیوان حیدرآباد میں نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اِن کے کلام میں بھی شیرینی، صفائی، لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔

| | |
|---|---|
| سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ | محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ |

دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دیے رنگ
لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے یمن میں

**سلطان عبداللہ قطب شاہ**
**سنہ ۱۶۲۵ع لغایت سنہ ۱۶۷۲ع**

عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے سنہ ۱۶۱۴ع میں پیدا ہوے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد سنہ ۱۶۲۵ع میں تخت نشین ہوے اُنھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ سنہ ۱۶۵۶ع میں جب شاہجہاں اُن سے ناراض ہوے تو شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اُس وقت ممالک محروسۂ دکن کے صوبہ دار تھے حیدرآباد پر چڑھائی کرکے اُس شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ عبداللہ نے اپنی شکست قبول کرکے تمام شرائط صلح منظور کر لئے اور اس وقت سے وہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور اُنھیں کی طرح ان کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ سب اُن کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں ان کے نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ فارسی اور دکھنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اُردو دونوں میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے ہیں۔ آصفی ہلکاپوری نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کے اکثر اُردو اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا | تماشا ہے اُجالے میں اُجالا |
| آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا | کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث |

| | | |
|---|---|---|
| جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے | | سو مخفی نہیں اُس پہ ہیں آشکارا |

ابن نشاطی | اس زمانہ کے شعرائے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ گولکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے ان کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک مثنوی موسوم بہ "پھول بن" کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے اس کا نام اسکی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بساتین کا ترجمہ ہے اسمیں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کنچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریبًا ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اسکی تصنیف ۱۰۶۶ھ میں ہوئی۔

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" | غواصی نے بزبان دکھنی ایک مثنوی لکھی ہے جس میں سیف الملوک شاہزادۂ مصر اور بدیع الجمال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قصہ سیف الملوک غالبًا الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے

[redacted]

جس کا ذکر کتاب کے اٹھارھویں شعر میں ہے۔ انھوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ سنہ ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سر چارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل یہ قصۂ ضیا نخشبی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اُردو میں ترجمہ ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنسکرت کی کتاب "سوگا شپتتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ سنہ ۱۸۰۱ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے اور سنِ تصنیف دیباچہ سے سنہ ۱۶۲۹ء (مطابق یکم رجب سنہ ۱۰۴۹ھ) پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گولکنڈے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| پڑی کچھ غواصی تنی کر خیال | کیا تازہ باغ بدیع الجمال |

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "غواصی تخلص در وقت جہانگیر سنہ ۱۰۱۴ھ-۱۰۳۷ھ بود۔ طوطی نامۂ نخشبی را نظم نموده است، بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی لطیفہ بلکٹ کہانی سیر سری دیدہ بودم شعر آں نظم یاد نیست"

**سب رس مصنفۂ مولانا وجہی**

ایک ضروری کتاب موسوم بہ سب رس کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا وجہی نے تصنیف کیا تھا۔ مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۰۴۰ھ یا سنہ ۱۰۴۵ء میں

تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سب اس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے بتلایا ہے کہ جنکی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ ایک مسلسل قصّہ ہے نیز یہ کہ اسکی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفّٰی ہے جیسا کہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ نفس قصہ مختصر ہے جس میں جا بجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اسکی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کُلیات کی ہے۔

**تحسین الدین** ممکن ہے کہ یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرضکہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جسکا نام "کامروپ کلا" ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ، شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اُسکو عجب عجب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اسکی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گارسن ڈیٹاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصہ "کامروپ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گیٹے نے اس نظم کو ترجمہ کرا کے سُنا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا۔

**ملا قطبی** اُنھوں نے سنہ ۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکھنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے سنہ ۹۵۰ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ ۷۸۶ بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملا قطبی نے اُسی بحر اور اُسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

**جنیدی** اِن کی نسبت کچھ اور معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مثنوی ماہ پیکر کے مؤلف ہیں جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۶۴ھ ہے۔

**طبعی** گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے سنہ تصنیف سنہ ۱۰۸۱ھ ہے۔ دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے۔ جو گولکنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ سے تھے اور خاتمہ پر ابوالحسن تانا شاہ کی تعریف ہے۔ یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی مثنوی ہے۔

**ابوالحسن قطب شاہ سنہ ۱۶۷۲ع لغایت سنہ ۱۶۸۶ع متوفی سنہ ۱۷۰۴ع** ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ گولکنڈہ کا سب سے آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا۔ یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدردان تھا۔ ایک شعر تذکرۂ گلشن ہند میں اُسکی طرف منسوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اُسکی وفات پر تخت نشین ہوا جب گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد سنہ ۱۶۸۷ع میں فتح ہوگیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اُسکی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اُس کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی۔

شعرائے ذیل ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے۔

نوری — سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ اِن کو اُن ملّا نوری سے نہ ملانا چاہیئے جو فیضی کے دوست تھے اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیٹاسی اور سر چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائز — یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تاناشاہ کے عہد کے شاعر تھے سنہ ۱۰۹۴ھ میں انھوں نے قصۂ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے نظم دکنی میں کیا یہ مثنوی قصۂ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانۂ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام سے ہے

شاہی — شاہ قلی خاں نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے شاہی ملازمت کرتے تھے رفتہ رفتہ تاناشاہ کے ندیم خاص ہو گئے۔ شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی تذکرۂ میر حسن میں اِن کا ذکر ہے۔

مرزا — ابوالقاسم متخلص بمرزا حیدرآباد کے رہنے والے تاناشاہ کے مصاحب تھے۔ تاناشاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہو گئے اور حیدرآباد میں بقیہ عمر بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرۂ میر حسن میں اِن کا ذکر ہے۔

عادل شاہیوں کا زمانہ
۸۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ

سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پیشتر بیجاپور میں اُردو زبان عام ہو گئی تھی امیر غریب ادنےٰ اعلیٰ

سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کردیا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور اُس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کردیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تاج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اُردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خافی خاں نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اُردو زبان جاری ہوگئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی
۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء

مثل بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین بیجاپور بھی نہایت تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اسکی تین مشہور فارسی نثریں جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ میر سنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کو

موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرودِ ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گویئے اُسے جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اُس نے علم موسیقی میں (دھرپد) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرودِ ہندی کے قواعد وضوابط قلمبند کئے تھے اور اُس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ ملا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔"
مصنف گل رعنا رقمطراز ہیں "کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بُلا کر تین چار ہزار گویئے بیجاپور میں جمع کئے اور سنہ ھ میں بیجاپور کے قریب نورسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گروا اور چیلوں کے لئے بڑی بڑی محلسرائیں بن کر طیار ہوگئیں۔ شاہی محلسرا کا نام نورس محل۔ شاہی مُہر پر نورسی سکہ پر نورس علم و نشان کے نام نورسی۔ بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔"

علی عادل شاہ ثانی
سنہ ۱۰۶۶ء لغایت سنہ ۱۰۸۳ھ

اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ ملک کا امن وسکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر حملوں سے درہم و برہم ہوگیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لئے اور افضل خاں کو جو بیجاپور کا سردار تھا قتل کر دیا۔ اسی علی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرمانروائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجاپور آیا جہاں علی عادل شاہ نے اُس کو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو دکھنی سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ دکھنی شعرا کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خافی خاں

بلو شاہے بود باہوش سیاہ دوست در سخاوت و شجاعت و وسعتِ خُلق مشہور
درحقِ شاعرانِ ہندی زیادہ مراعات می فرمود۔ در عہدِ او ترجمۂ یوسف زلیخا تالیفِ
ملاجامی و ترجمۂ روضتہ الشہدا و قصۂ منوہر و مدمالت کہ عاقل خان خوافی بہ نظم
درآوردہ ملا نصرتی و دیگر شاعرانِ بیجاپور بہ زبانِ دکنی تالیف نمودہ از نقد و جنس
صلۂ وافر در خورِ سلاطین یافتند۔" اس عہد کے مشہور شعراء یہ ہیں۔ رستمی۔ نصرتی
شاہ ملک۔ امین۔ سیوا۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا۔

رستمی | رستمی کا نام کمال خاں ولد اسمعیل خاں۔ دربار بیجاپور سے اس کا
تعلق تھا۔ رستمی نے خدیجہ سلطانہ شہربانو بیگم کی فرمائش سے ۱۰۵۹ھ میں
خاورنامہ کا فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاورنامہ میں جناب امیر علیہ السلام
کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے شہربانو بیگم کا
عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا[۱]۔

نصرتی | اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں بقول سید شمس اللہ قادری
"نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ ان کے آبا و اجداد بیجاپور میں
فوجی ملازم اور والد رکاب شاہی کے سلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا
ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے
بیجاپور کے مشاہیر فقرا میں اُن کا شمار ہوتا ہے گلشن عشق کے دیباچے سے
ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی
اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا[۱]۔"

[۱] ماخوذ از اردوے قدیم ۱۲

بدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنے تذکرہ شعراے دکن میں نصرتی کا اس طرح
کر کیا ہے "نصرتی تخلص، محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے
ابت داروں سے تھا۔ آپ کی گذر اوقات توکل و قناعت پر تھی۔
ت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا ۱۰۷۶ عیسوی میں
کنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا ۱۰۹۵ھ
بس فوت ہوا۔ نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید
معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے"۔ یہ نہیں معلوم کہ مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن
نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

## مثنویاں

(۱) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی
لکھی جسکا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات
نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانحات و فتوحات اور مجالس
عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔ ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد
مدحیہ بھی درج ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیئے
جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔

(۲) گلشن عشق۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۱۰۶۸ ہجری مطابق
۱۶۵۷ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمی بہ کنور منوہر پسر سورج بھان
اور مدھ مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز
سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور

شمع و پروانہ اُس کا نام رکھا ہے ۔ یہ مثنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق ۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بھتات ہے ۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے ۔

(۳) گلدستۂ عشق مصنفہ ۱۰۶۸ھ لغایت ۱۰۸۳ھ

بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری مثنوی ہے مگر بقول ڈ ٹیاسی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے ۔ نصرتی کا ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے ۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے یہ بزمانہ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا ایک سو اکتیس شعر اس میں ہیں ۔ بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور اُن کی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے ۔ سر چارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہمن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے ۔

ہاشمی

سید میراں نام اور بیجاپوران کا وطن تھا ۔ ہاشمی تخلص تھا ۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے ۔ ہاشمی مادر زاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے ۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے ۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام ایک مثنوی دکنی میں لکھی اور یہ ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوئی ۔ اسمیں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے ۔ شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ہاشمی نے

نا دیوان بھی مرتب کیا تھا جسمیں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات
ور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اسوقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے
یکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جسقدر غزلیات ہیں اُن کا بیشتر حصّہ
ریختہ کے بجاے ریختی میں ہے"۔ قدیم بھاشا کا رنگ اُن کے کلام میں بہت ہے
کثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت
کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ۱۱۰۹ھ میں
انتقال کیا۔

دولت — یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انھوں نے ۱۶۴۰ء میں ایک قصہ
موسوم بہ شاہ بہرام و بانوے حُسن تصنیف کیا جس میں بہرام گور اور ایک پری
موسوم بہ بانوے حُسن کے عشق کا ذِکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب
واقعات پیش آئے تھے اُن کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک — ان کا ذکر اُردوے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور
علی عادل شاہ کے معاصر تھے اُنھوں نے ایک رسالہ احکام الصلوۃ کے نام سے
نظم دکنی میں لکھا ہے اور اُس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں یہ رسالہ
کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۰۸۶ھ میں تمام ہوا۔

شاہ امین — شیخ امین الدین اعلی کا تخلص ہے۔ آپ بیجاپور کے اولیاے کبار
سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا
آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اسی حالت میں
آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقایق کو جمع کیا اور

اِس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دو رسالے اِن سے اور یادگار ہیں۔
رسالۂ قربیہ۔ رسالۂ وجدیہ۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا

مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری بیجاپوری تھے۔ یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ آگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابوالفضل وفیضی کا ساتھ رہا۔ اِن کے بعد اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں ہوگا۔ یہاں پر صرف اُن کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری۔ قطب شاہی دور کے کاظم علی۔ رام راو وسیوا۔ سیوا نے روضتہ الشہدأ وقانون اسلام لکھیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہدِ حکومت میں

بیجاپور وگولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کرلیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن شعرائے اُردو کی قدر ومراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اُردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اُردو شعر وشاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اُردو شعرا ذیل میں درج ہیں۔

عاجز

محمد علی تخلص عاجز۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود تھے۔ ان کی تصنیفات سے قصۂ فیروز شاہ ہے جو اُردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے دوسری تصنیف قصۂ لال وگوہر ہے اسمیں لال زمرد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر جواہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق ومحبت کا افسانہ مذکور ہے قصہ ملکہ مصر بھی عاجز نے فارسی سے دکھنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر مشرح طور پر اُردوے قدیم وتاریخ شعرائے دکن میں درج ہے۔

بحری | قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحرالدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجا پور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۹۷ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو حیدرآباد چلے آئے۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہوگیا۔ آپ کی تصنیف "من لگن" تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ بزبان دکنی ۱۱۱۲ھ ہجری میں تمام ہوئی۔ زبان اسکی مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

امین | شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گزرے۔ انھوں نے یوسف زلیخا کے فسانہ کو دکنی میں ۱۱۰۹ھ میں منظوم کیا۔

ولی دکھنی | سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مرأۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلوران کا وطن تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے وہاں حراست خاں نام ایک امیر رہتا تھا۔ ولی عرصہ تک اسکی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کرڑپہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات ولی نے "رتن پدم" کے دیباچے میں بیان کیے ہیں اسکو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے۔ دوسری تصنیف "روضۃ الشہدا" ہے اسمیں کربلا کے واقعات منظوم کیے ہیں اور یہ ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی [ے] ہے۔

وجدی | بقول نصیرالدین ہاشمی مؤلف اردوے دکن "اس تخلص کے

ے ماخوذ از اردوے قدیم ۱۲

دکن میں دو شاعر ہوئے ہیں ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ میں لکھی اور دوسرے وجدی جنھوں نے بارھویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں اُس میں سے ایک پنچھی نامہ ہے جو شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو وجدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا۔ بقول مؤلف اُردوے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی گل وہرمز کا ترجمہ ہے جو خسرونامہ یا خسرو وگل بھی کہلاتی ہے یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اسکی تعریف اس طرح مذکور ہے ۔

| | |
|---|---|
| دسے اسکی تاریخ مجھکوں عیاں | پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں ۱۱۵۳ |

غالباً مؤلف اُردوے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے اِن سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اُس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی اور "باغ جانفزا" سے اسکی تاریخ نکالی ہے [1]

**آزاد** فقیر اللہ متخلص بہ آزاد۔ حیدرآباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے اِن کا ذکر تذکرۂ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے ۔

**شعرائے اورنگ آباد** اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے کھرکی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اُس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امرا و علما و مشائخین جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد

[1] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲

...ے آئے اور حیدر آباد و بیجا پور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد
...ی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات
...ید عبدالولی عزلت کی بیاض۔ لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا میر بہاءالدین
...روج کے بہار و خزاں اور محمد افضل کے تحفۃ الشعرا و تذکرۂ موسوی خاں میں
...تحریر ہیں میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

| |
|---|
| ولی سنہ ۱۶۶۸ عیسوی |
| تا غایت سنہ ۱۷۴۴ع |

ولی کو اُردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اُردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اُردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں۔ مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہوگئے اُس وقت سے اس خیال کی تردید ہوگئی مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اُردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہونچی وہ کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ اِن کو اِن کے معاصرین اور مابعد کے قریب العہد شعرا مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے اُستاد مانا ہے اور اُن کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

| |
|---|
| نام کے متعلق اختلاف |

ولی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک اُن کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام شمس الدین لقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں۔ میر حسن دہلوی۔ مرزا علی لطف و نساخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے۔ اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ

کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے۔ جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہوگیا۔

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف

گارسن ڈیٹاسی۔ بلوم ہارٹ۔ اور میر حسن کا یہ خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۷۸ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی جسکی تصدیق میر تقی میر کے تذکرۂ نکات الشعراء سے بھی ہوتی ہے ولی کا تعلق خاندانی شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے۔ البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بعیت رکھتے تھے۔ کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ اُنھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرۂ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُن کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں اُن کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے مگر ہماری راے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ گجرات اُنکا مولد و مسکن تھا۔ اسی طرح اُس مثنوی سے بھی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی ہے اُن کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا۔

حالات زندگی

اورنگ آباد میں پیدا ہوے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم

کرتے رہے بعدازاں احمدآباد گئے جو اُس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور و دراز سے تحصیل علوم کے لیے آتے تھے داخل ہوے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مُرید ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعر و شاعری شروع کی اور اُس میں انھیں پورا انہماک ہوگیا۔ ان کا کلام تقریبًا سب اصناف سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد گئے۔ جہاں اُنھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سُنایا اور اُنھوں نے اُس کو بہت پسند کیا۔

ولی کے دو سفر

تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلّی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی ۱۷۰۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کریگا" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہوے تھے۔ البتہ اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انھیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابوالمعالی کے ساتھ سفر کیا جسمیں دلّی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابوالمعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو درجۂ عشق کو پہونچ گئی تھی۔ ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۱۳۴ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں ہوا اس سفر میں ولی اپنے ساتھ اپنا دیوان ریختہ لائے تھے جسکی نہایت قدردانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اُسکی شہرت ہوئی کہ

امرا کی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں اُسکے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے اُن کے اشعار کو سن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہوگیا ۔

**دہ مجلس** ۱۱۴۱ھ میں دلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہداے کربلا کی شان میں ایک مثنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جسکے اِن دو آخری شعروں سے اُس کا سنہ تصنیف اور اُس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے ۔:۔

| | |
|---|---|
| ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال | تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال ۱۱۴۱ |
| کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول | ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول |

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ ولی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے لیکن وہ ناپید ہوگیا ہے ۔

**وفات** ولی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہوگئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرۂ شعراے دکن ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے ۔

ولی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال۔ گوہر لال۔ اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ۔ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر اُن کے اشعار میں موجود ہے۔ وہ گو کہ حنفی المذہب تھے جیسا کہ صحابۂ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو اُن کے اشعار میں موجود ہے، مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے اُن کو کوئی تعصب تھا

کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے۔ انھوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دور و دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں اُن کا جانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔ مگر گارسن ڈیتاسی اُن کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے البتہ ستارا۔ دلی۔ اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف اُن کے اشعار میں موجود ہے مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر | بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر |
| کہ ہے مشہور اس کا نام سورت | کہ جاوے جسکے دیکھے سب کدورت |
| بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت | ہر اک صورت ہے واں انمول صلوت |

دلی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے تتبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جا بجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پر رائے — اُن کی تصانیف باعتبار قدامت اور نیز باعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے اِن کا تتبع کیا ہے اور انھیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی سلاست اور ترنم اِن کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً :۔

| | |
|---|---|
| دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے | زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے |
| دشمن دیں کا دین دشمن ہے | راہزن کا چراغ رہزن ہے |

[redacted]



آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُسکو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اُس پشیماں کو — جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں

خوبرو خوب کام کرتے ہیں — اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دِل ہوا ہے مرا خراب سخن — دیکھکر حسن بے حجاب سخن

بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے — جس کو ہے نشۂ شراب سخن

راہ مضمون تازہ بند نہیں — تا قیامت کھلا ہے باب سخن

گوہر اُسکی نظر میں جا نہ کرے — جس نے دیکھا ہے آب و تاب سخن

ہے سخن جگ منے عدیم المثل — جز سخن نہیں دوجا جواب سخن

شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی — دِل ہوا ہے مرا کباب سخن

عرفی و انوری و خاقانی — مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن

اے ولی درد سر کبھو نہ رہے — جب ملے صندل و گلاب سخن

**داؤد** مرزا داؤد نام داؤد تخلص وطن اورنگ آباد ولی کے معاصر تھے اور ۱۱۶۶ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان اِن سے یادگار ہے۔

**سراج** سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوے۔ آپ نے اپنا حال منتخب دواوین کے دیباچے میں لکھا ہے[۱]۔

[۱] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲

اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" ۱۱۶۹ھ ہجری ہے۔ سراج نے اِس میں متقدمین و معاصرین شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے مجموعہ ضخیم ہے اور اسمیں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دواوین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقادِ سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوشِ جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالمِ بیخودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالتِ مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر تحریر کے دائرہ میں نہیں آئے اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہوجاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمن الچشتی المتوفی ۱۱۶۱ھ کی خدمت میں پہونچا حسن ارادت سے مرید ہوا۔ اُن دِنوں میں بپاس خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے حرف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی"۔ سراج ایک درویش منش پاکباز بزرگ تھے مسافر دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و پاکیزہ دل۔ ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے اسمیں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے قوال و گویّے آپ کی غزلیں سناتے تھے۔ محلس میں آپکا وہ رعب وداب تھا کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ اُس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار

دولت آبادی۔ ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی۔ محمد فقیہ درد مند۔ مرزا محمد باقر شہید۔ وجان مرزا رسا۔ موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی وعبدالقادر سامی اورنگ آبادی عارف الدین خاں عاجز موسوی خان فطرت۔ خافی خاں۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعرا وعلما ومشائخ تھے خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔

میر نے نکات الشعرا میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا۔ مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی نہیں تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا جسمیں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے منتخب دیوانہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں ایک ہزار سات ابیات ہیں اور گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۶۹ھ ہجری میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و ذو معانی الفاظ سے پاک وصاف ہے۔ سیدھا سادہ بیان ہے تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے کرشمے۔ بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ مضامین میں شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دکن میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچے۔ ولی نے اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے اُن کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا۔ آپ نے چوتھی شوال

یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا - یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے -

خبر تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اِک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافلِ یار کا گِلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حُسن کا اثر اسقدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جِلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

دیگر شعرا اس دور کے

اِس دَور میں بہت سے شاعر گذرے ہیں - جن کا ذِکر بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے - ان کے نام و حالات تذکرہ لچھمی نرائن و تذکرہ موسوی خاں و نکات الشعرا میر - تذکرہ شعرائے اُردو میر حسن - تذکرہ شعرائے دکن مؤلفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری - "دکن میں اُردو" مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی سے

معلوم ہوسکتے ہیں۔ بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں:- عارف الدین عاجز - سید عبدالولی عزلت - یار - محرم - آیما - داغ - رنگین - مہدی - عزیز - صارم - مہر - پناہ - رضا - عراقی - مہتاب - شرافت - شہید - ضیا - کاظم - مبتلا - نجم - ہمدم - درد - حشمت - حاجی - قادر - فخر - فتوت - قدر - ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نام آور ہیں اور جو حالات کہ مصنف گل رعنا نے ان شعرا کے درج کئے ہیں وہ زیادہ تر تذکرہ شعراے دکن سے ماخوذ ہیں -

**احاطۂ مدراس و آرکٹ کے شعرا**

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ ویلور میں پیدا ہوے اور انھوں نے اردو زبان میں سیر- عقاید فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۱۸۵ھ سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان سلف وطناً بیجاپوری تھے مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ "درخیابان کرناٹک ہمچو او نہالے سربالا نکردہ و از گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ دمیدہ" اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ہشت بہشت - تحفۃ الاحباب - تحفۃ النساء - فرائد در عقائد - ریاض الجنان - محبوب القلوب - روضۃ السلام - گلزار عشق - قصہ رضوان شاہ - روح افزا - خمسہ متحیرہ - مثنوی روپ سنگار - ارکاٹ کے دربار کے مدارالمہام شرف الملک مولانا محمد غوث - اور ان کے خلف مولانا قاضی بدرالدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ اس وقت کے شعرا کے نام ذیل میں رقم ہیں - محمود - صبائی - احمد - اعظم [1]

---

[1] ماخوذ از اردوے قدیم ۱۲

# باب ۵

# اساتذۂ دہلی

## حصۂ اوّل طبقۂ متقدمین

## حاتم و آبرو کا زمانہ

دلی میں اُردو زبان کی ابتدا و ترقی۔

اُردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حاصل کر چکی تھی اور اُس میں اُس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ برخلاف اسکے جہانتک معلوم ہوا ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولانا جمالی جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور ۹۴۲ھ ہجری میں فوت ہوے۔ ملا نوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے مُلا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے اُن کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اُردو ہیں لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر۔ اکبر و جہانگیر۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور اُن کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح

مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔ اس کے نمونے اُردوے قدیم اور تذکرہ گلِ رعنا میں موجود ہیں۔ شاہ جہاں کا اُردو میں شقہ لکھنا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہوگئی تھی۔ بازار سے شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بولتے اور سمجھتے تھے[1]۔

عالمگیر کے زمانہ سے دلی میں اُردو شعرگوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعرا نے توجہ کی۔ موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدل۔ مرزا عبدالغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لئے اُردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں ساوات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اُس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہوگئے۔ محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں اُمید۔ سلیمان قلی خاں وداد۔ علی قلی خاں ندیم شیخ سعداللہ گلشن۔ مرتضیٰ قلی خاں فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ مرزا عبدالقادر بیدل سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دِلّی میں جمع تھے۔ شمس ولی اللہ دکن سے آگئے۔ فراقی۔ فخری۔ آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے۔ ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور اُن کا رنگ دلّی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدردانی کیگئی۔ جو شعرا صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے اُنکو اُردو میں بھی

[1] اُردوے قدیم ۱۲

شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُمید۔ بیدل۔ فراق۔ آرزو نے اُردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دلّی سے اُردوے معلّی کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی[۱]۔

**اُردو لغات کی ترتیب** قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اُردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے (جنکی قواعد فارسی اور گلستاں بوستاں کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اُردو و ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اُس کا نام "غرائب اللغات" رکھا اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علیخاں آرزو نے اس کی نظر ثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کیے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے "نوادر الالفاظ" کے نام سے موسوم کیا[۲]۔

**دِلّی کے پُرانے شاعر** جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اُس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہمعصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے، ریختہ کا آباے قدیم سمجھنا چاہیے یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز ابتک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدے دکنی لفظ و

**زبان کے ساتھ اُن کی خدمات** محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اِسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات

---

[۱] گل رعنا ۱۲ [۲] اُردوے قدیم ۱۲

تصفیۂ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ اُنھوں نے یہ مشکل کام بہت حسن وخوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا اسی لئے اُن کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی اُن کی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اِن لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور دقت نظر سے کام لیا۔ اور بھدے ناتراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اُسی کے وہ مشاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوچ اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی اِس لیے یہ سب جدید تصرفات اُس نے آسانی سے قبول کر لئے۔

صنعت ایہام

ولی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جسکا ذکر پیشتر کیا گیا یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہروں کی جان ہے قدما کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ شاہ مبارک آبرو۔ یک رنگ۔ شاکر ناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا اور اُس کو اپنا مستقل فن بنالیا تھا۔ مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر۔ سودا۔ میر۔ قائم نے اس کا رواج بہت کم کر دیا اور میر درد۔ فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا میر فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے | کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں |

سودا فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھکو دورنگی | منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں |

قائم چاندپوری ؎

| | |
|---|---|
| وہم رسم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چیں | یہ کہہ گیا ہے کہ آؤنگا آج میں سرِ شام |
| بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ | تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام |

تصوف — ایک دوسری خصوصیت اُس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعرا اکثر صوفی مشرب ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُردو شاعری اُسی کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزو اعظم تھا۔ انھیں اسباب سے اُردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصہ چڑھ گیا۔

سپاہی پیشہ شعرا — اس زمانہ کے شعرا اکثر سپاہی پیشہ ہوتے اس وجہ سے کہ زمانہ بہت پر آشوب تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بدامنی سلطنت کی کمزوری۔ ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہگری کا پیشہ نہایت عزت اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یکرنگی کی کمی اور سبک و مبتذل الفاظ — ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعراء کا کلام یکرنگ نہیں مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اُس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے۔ مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے

اس زمانہ میں معمولی اور سوقیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اُس وقت تک تفنن طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی نہ کہ اُس میں مزاولت اور مشق مدنظر تھی۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو۔ حاتم۔ ناجی مظہر کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں۔ میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ جواب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کیئے جائیں۔

اس عہد کے شعرا کا طرز بیان اور اُن کے کلام کی خامیاں

نظم ابھی پختگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہونچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آجکل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا۔ جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جسکی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کردیے گئے مگر اُس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں۔ خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی

الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا قدیم محاورات والفاظ جو دلی کے زمانے میں مستعمل تھے اُن میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی تاریخ شعراے اُردو میں درج ہے کہ "مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اُس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے، نہ صرف اُسی کے کلام میں بلکہ اُس کے ہم عہدوں کے کلام میں اُس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔"

شاہ مبارک آبرو
متوفی ۱۱۶۹ھ

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر افسوس کہ دیوان زمانۂ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ "آرائش معشوق" بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جسکی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص پیر مکھن خلف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر اُن کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی فتحعلی

اور لطف وغیرہ اُن کے مداح ہیں اور اُن کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرأ میں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں۔ اِسی وجہ سے کبھی کبھی کلام سبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ گو وسعت معلومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۵۰ء میں بچاپس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔

خان آرزو ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خان متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعرأ اور ناقدان فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "اِن کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زباں نہ تھا"۔ میر حسن ان کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان کا خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی مدح سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی ان کو اُن کے نام کی مناسبت سے "چراغ محفل فصاحت" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد انکی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کو زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اُس زمانہ کے شعرأ کا جگت استاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے اُستاد تھے۔ گو اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے استاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ میر۔ سودا۔ مظہر۔ درد۔ ایسے قادر الکلام اُن کو اُستاد مانتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے شعر کہنا ابتدائے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کاملہ

حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصبدار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۳۲ھ میں دہلی واپس آئے۔ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندوستان آئے جہاں اُن کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزو کو کمال فن اور استغنا اسکی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر ان دونوں باکمالوں کا سامنا ہوگیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں اُن کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے اور اُن کو ایک رسالہ مسمی بہ تنبیہ الغافلین[ف] کی صورت میں شائع کیا۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی اور تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پیوند زمین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ انکی قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلم ہے۔ تصانیف بہ کثرت ہیں منجملہ اُن کے کتب ذیل موجود ہیں ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا۔ شرح سکندر نامہ و قصائد عرفی۔ و گلستان سعدی۔ لغت فارسی موسوم بہ "سراج اللغات"، لغت اردو موسوم بہ "غرائب اللغات" جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مسمےٰ بہ نوادر الالفاظ کی شرح ہے۔

رسائل "موہبت عظمیٰ" اور "عطیۂ کبریٰ" فن بلاغت معانی و بیان ہیں۔ تذکرہ "مجمع النفائس" جس کو تذکرۂ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں اُن ہندوستانی اور

---

[ف] اسی نام کا ایک رسالہ سودا کا بھی ہے جسمیں فاخر مکین کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔

دکنی شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے بزبان فارسی شعر کہے ہیں۔ انمیں سے میر تقی میر نے اپنے تذکرۂ "نکات الشعراء" میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریبًا پندرہ تصانیف خان آرزو کی کہی جاتی ہیں مشہور اُستاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور چھوڑ گئے۔ زبان اُردو ایسے محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء عیسوی

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بہ طرز ولی و مضمون و ناجی و آبرو لکھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوے۔ تاریخ ولادت ۱۱۱۱ھ لفظ ظہور سے نکلتی ہے۔ جو ۱۷۰۰ء۔ ۱۶۹۹ء کے مطابق ہے سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبۂ الہ آباد کی رفاقت میں رہے ۱۷۲۲ء میں جب دیوان ولی دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہونچ گئے خواجہ میر درد میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے استاد مانے گئے ہیں۔ دو دیوان اُنکی طرف منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں جسمیں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات سے منتخب کرکے مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و ناجی کے طرز میں لکھا تھا تذکرۂ قدرت میں

لکھا ہے کہ " فاما زعم شاعری بسیار دارد، دیوان قدیم او از نظر ایں مؤلف گذشتہ بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم"، محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے اپنے دیوان کے دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جسمیں سب سے پہلے مرزا رفیع سودا کا نام نامی ہے یہ ایسے شاگرد تھے جن پر اُستاد کو بھی فخر تھا۔ اور مشہور شاگردوں میں رنگین۔ نثار۔ تاباں۔ فارغ بھی ہیں شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش و ناسخ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اُس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ افسوس ہے اُن کے معاصرین نے اُنکی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہو جاتی۔ شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں " خوشہ چین خرمن سخنوران عالم بصورت محتاج و بمعنی حاتم کہ از ۱۱۲۹ھ تا ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را اُستاد می داند۔ اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو۔ و شرف الدین مضمون و مرزا جان جانان مظہر۔ و شیخ احسن اللہ احسن۔ و مرزا شاکر ناجی۔ و غلام مصطفےٰ یکرنگ ست۔ و لفظ ورد بر وزن و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا

از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشند و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ آرند منظور دارد و زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود...... مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود"۔ اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان صاف سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۷۹۱ء یا ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا[۵۱]۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرے میں "مرد جاہل و متمکن" اُن کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن اُن کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کو نغمہ سرایان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اُردو میں متفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے اُستاد تھے۔ اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں اُنھوں نے بہت نمایاں حصّہ لیا۔

---

[۵۱] مصنف خمخانۂ جاوید کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ ہجری میں انتقال کیا ۱۲

**میاں مضمون متوفی ۱۷۴۵ء**

شیخ شرف الدین متخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| اکریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید | کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید |

جاجمؤ صوبۂ اکبر آباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا بچپن میں دلّی گئے اور زینۃ المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف با مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ میر ان کو "ھنگامہ گرم کن مجلسہا" لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے اُستاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے۔ ایک دیوان دو سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات وایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے مملو ہے۔ گو کہ سن میں آرزو سے بڑے تھے۔ مگر شعر میں اُن سے مشورہ کر لیتے تھے میر اُن کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشاق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی اُنکے بہت معترف ہیں۔ خان آرزو اُن کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔ اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت اُن کے گر گئے تھے۔ ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں انتقال کیا۔

**مرزا مظہر جانجاناں ۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۱ء**

شمس الدین نام جانجاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب اُن کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے

نواسے تھے۔ صوفی باصفا اور شاعر یکتا تھے۔ کلام میں جسقدر متانت اور تاثیر ہے اسی قدر توحید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔ مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن ڈیتاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ سنہ ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۹۰ء میں۔ مگر مولانا آزاد کی تحقیق کے بموجب سنہ ۱۱۱۲ھ میں بمقام کالا باغ صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور نسبًا علوی تھے اور خاندان شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے شوق تھا شیخ محمد فضل سیالکوٹی سے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تین برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحبدل تھے سیکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بعیت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "مردیست مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرۂ عالم، بےنظیر، معزز، مکرم، اکثر اوقات دریاد الٰہی صرف می کند خوش تقریر بمنزلہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد" حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اُس زمانہ کے شہرۂ آفاق حسین و خوب رو شاعر تھے۔ بہت محبت اور اختلاط تھا۔ عالم متبحر۔ فقیہ کامل حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع ضرب المثل تھی۔ استغنا و بےتعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں۔ محمد شاہ نے

ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصہ چاہیئے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیشکش کیے قبول نہ ہوے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا منظور نہ ہوا۔ استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپکا اخلاق شگفتہ روئی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اُردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ اسوجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں[۱]۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ

[۱] مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و نمود دور ایہام گویاں بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست ۔۔۔۔۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان اُستاد جلوہ ظہور می ہد فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا ست بعدہ تتبعش بدیگراں رسیدہ" ۱۲ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں "میگویند اول کسیکہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ و ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص مظہر مرد یست فرشتہ صفت" ۱۲ انشا اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "از بسکہ آوازہ فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را مقر خود میداشت دل با دیدہ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں حضرت ست باز میداری" ۱۲ میر صاحب لکھتے ہیں "دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مؤلف آمدہ است از تسلیم و تکلیم پاسے کمی ندارد" ۱۲ میر حسن لکھتے ہیں "از فصحائے زماں و بلغائے دوراں" ۱۲

سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ تصوف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من وعن اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی ایک ہزار ابیات کا جو ۱۱۸۰ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے جسمیں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اُردو اور ایک بیاض "خریطۂ جواہر" فارسی شعراء کے منتخب کلام کی آپکی تصانیف سے یادگار ہیں۔ وفات نہایت افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرۂ محرم تھا تعزیے نکل رہے تھے مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے اُن کی سیر کر رہے تھے۔ مشہور ہے کہ اُن کی زبان سے نکلا۔ کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور وغل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے ڈھانچوں کا اسقدر ادب واحترام کرنا خلاف عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیہ لیجانے والوں نے سُن لیا اور برسر پرخاش ہوگئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر وارد ہوے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہوا باہر نکل آئے۔ ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری۔ مرزا صاحب زخمی ہوے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیان۔ مصطفےٰ خاں یکرنگ۔ بساون لال بیدار۔ اور محمد فقیہ دردمند مشہور شاعر صاحب دیوان ہوے ہیں۔

**ناجی** سید محمد شاکر نام ناجیؔ تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے نعمتخانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور دلی کے معاصر عہد محمد شاہی کے

شعرا میں ہیں جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُر درد حالات ایک مخمس میں بیان کیے ہیں عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو اُن کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز شوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ "مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منھ بنائے رہتے"

اِن کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہے بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اُس زمانہ کا رنگ ہے۔

تاباں — میر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوشرو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زباں زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے اِن کے حُسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اُسی حُسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے حُسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روے صبیح کی زیارت کے لئے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر ایک شخص پر جن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کو اِن کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ اُن کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مئنوشی کثرت سے کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے استسقاء ہوگیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ

اُنھوں نے اُن کو ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا اور جب بھی وہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۶ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک وہ زندہ تھے۔ میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں" نوجوان بامزہ بود۔ سید نجیب الطرفین۔ مولداو شاہجہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوشخلق و پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج۔ تاحال درفرقۂ شعراء ہمچوں او شاعر خوش ظاہر از مکمن لطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" آگے اُن کی مے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ" آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود۔ ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ اومی رفتند اورا مست طافح می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے بھی مجبور ہوکر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ اِن کا کلام عاشقانہ شیریں ونمکیں ہے۔ خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔ لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو اُن کا اُستاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

**یکرنگ** مصطفے خاں یکرنگ خان جہاں لودی کے احفاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی عزت وآبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنوران دہلی میں شمار کئے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور میاں مضمون کے طرز کا ہے۔ بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا

اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیادار عشق مجازی کا مگر عرفا اُنکو عشق حقیقی کا پرتو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔

فغاں متوفی ۱۷۷۲ء

اشرف علی خاں متخلص بہ فغاں خلف مرزا علی خاں نکتہ۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی پھبتی کہنے کے مشاق[۱] تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغاں مرشدآباد چلے گئے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں برسر اقتدار تھے۔ مرشدآباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے۔ اور نواب نے اُن کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ چونکہ نازک مزاج واقع ہوے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی، نواب نے جوش اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا) جہاں مہاراج شتاب رائے نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں

---

[۱] میر نے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناگر مل کو "گھی کی منڈی کا سانڈ" اور ایک شخص مسمیٰ بہ حکیم معصوم کو "گاؤ گجراتی" کہا کرتے تھے ۱۲

پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوے۔ ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا
جسمیں تقریبًا دو ہزار اشعار ہونگے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب
ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونو باکمال ان کے معرف ہیں۔
سودا نے ان کے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے۔ میر صاحب ان کو قزلباش
خاں امید کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں۔
فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔
کلام نہایت پاکیزہ۔ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کردی تھی۔ مبتذل
اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے
قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب اُن کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا"
کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات۔ قصائد۔ قطعات۔ رباعیاں۔ مخمس سبھی کچھ ہیں۔

**باقی اور شعرا** اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے
شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے
تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور
اُن کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں
اُن سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جو دلی کے
رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا انھوں نے
عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا
میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

# باب ۶

## اساتذۂ دہلی

## حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

## میر اور سودا کا زمانہ

اردو شاعری کا زریں عہد

یہ دَور اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے ۔ اسی میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی ۔ اسی میں میرحسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحب کمال پیدا ہوے۔ جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں کہ جب تک زبان اُردو دنیا میں رہیگی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام اصناف سخن اس عہد میں انتہاے کمال پر پہونچے۔ مثنوی میں میرحسن کی مثنوی "سحرالبیان" قصیدہ میں سودا کے قصائد، غزل میں میر اور درد کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل استاد اپنے اپنے فن میں بےنظیر اور بےمثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آیندہ نسلوں کے واسطے ایک بےمثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرور ایام سے کم نہیں ہوسکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوق۔ غالب ناسخ۔ آتش سب اِن کا لوہا مانتے تھے۔ اور انکی اُستادی اور قادرالکلامی کے دل سے قائل تھے ۔

| | |
|---|---|
| ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب | ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا |

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

زبان میں فارسیت کا غلبہ

اس عہد میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔ میر، سودا اور دیگر استادان فن اپنے پیش رووں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و میر ضیاں مکین نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ نکال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے تذکرۂ جلوۂ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جسکو شعر الہند میں نقل کیا ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اُردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں۔

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور اُنکے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی۔ جلال۔ اسیر۔ کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعرا کے کلام کی اندرونی شہادت

سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے متاخرین شعرائے فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے۔ چنانچہ سودا و میر و درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرائے فارسی مثل صائب۔ بیدل۔ نظیری۔ عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور اُن کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔ سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اُسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

**الفاظ میں تذکیر و تانیث** الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مؤنث لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے۔ مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث، مربع، کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتداء فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور ہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اُسی وقت درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے۔ مشکل مشکل بحریں اور قافیے اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

**شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں** افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔

چنانچہ میر، سودا، میر حسن، سوز وغیرہ اس پر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اُس وقت شعرا و کملا کا ملجا و ماوا تھا اور ہر فن کے اُستاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ صرف میر درد ہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنھوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔

کلام کی خصوصیت

اس عہد کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار اور فصیح الفاظ ملے جلے ہیں غزلوں میں شتر گربگی و ناہمواری۔ میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ اُن کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں یہی حالت ورڈسورتھ[1] شاعر کی ہے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا کلام موقع بیموقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پرگو کون ہوگا پس اُن کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے یعنی اُسیوقت کہتے تھے جب طبیعت مُلہم ہوتی تھی اسی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے

متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا۔ کیونکہ اِس سے اُس زمانہ کے حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور

---

[1] دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۵۱

میر حسن کا تذکرہ "شعرائے اُردو" اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ انہیں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعرا اردو کے مورخ کے لئے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد سنہ ۱۱۳۳ھ تا سنہ ۱۱۹۹ ہجری

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جنکی تعریف میں سودا نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوے تھے۔ خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر اُن کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر جب جوان ہوے تو شاہی منصب دار مقرر ہوے۔ مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پر اثر طریقہ سے بیان کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۳۳ھ ہے۔ اُنھوں نے اپنے والد ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

کہ سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اُٹھائیس
برس کی عمر میں دُنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفر آخرت
اختیار کیا۔ تو اُنتالیس برس کے سن میں اُن کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے
خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد جہانگیری سے اُن کا
انتساب اور سلسلۂ نقشبندیہ میں اُن کا شیخ وقت ہونا۔ یہ سب باتیں اُن کو مرجع
خاص وعام بنائے ہوئے تھیں۔ پھر اُن کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان
و تصوف سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ اُن کے دل سے گرویدہ تھے۔
غریب سے لیکر امیر اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک اُن کی بے انتہا عظمت کرتے
اور اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے معاصر تذکرہ نویس اُن کے اس خاص امتیاز
اور اُن کی بزرگی اور خدارسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں
اور لکھتے ہیں کہ وہ مجسّم تہذیب و متانت اور پیکر آداب و
اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے قناعت و توکل اور رضا
و تسلیم اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا
حملہ ہوا اور اُس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس
و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی سے
نکل کر لکھنؤ پہونچے مگر اس مرد راہ خدا کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کیے
اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھا رہا۔ اور اسکی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ
میں ذرہ بھر فرق نہ آیا طبیعت میں آزادی۔ خودداری اور استغنا اس درجہ تھا
کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خوددار طبیعت بھلا خوشامد

ورہٹی کیونکر گوارا کرسکتی تھی۔ دنیاداروں کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا
ان کو بیحد شاق تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں
عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کی بزم سماع میں چلے آئے جسکی شرکت کو وہ
اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پاؤں پھیلا دیے۔ خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار
ہوا۔ بادشاہ اُن کے چشم و ابروسے سمجھ گئے۔ فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں۔ پاؤں
میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی۔ حضرت کو
موسیقی سے بھی بڑا ذوق تھا۔ خود اس فن میں صاحب کمال تھے۔ بڑے بڑے
کلاونت اور گویے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے
دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی۔
جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے۔ اور اپنا کمال دکھلاتے۔
میاں فیروز جو اُس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال
سے حضرت کو محظوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوزخوانی اور مرثیہ خوانی
کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے
دولت کدہ پر اکثر منعقد ہوتے جنکی شرکت کو بڑے بڑے رئیس و امیر اپنی
سعادت و فخر سمجھتے۔

**تصانیف** خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا
کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں اُن کی تصنیفات سے ہیں۔

(۱)۔ رسالۂ اسرار الصلوٰۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔
(۲)۔ واردات درد انتیس برس کی عمر میں لکھی اور اُس کی شرح میں

(۳) علم الکتاب - ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جسمیں ایک سو گیارہ رسالے ہیں -
(۴) نالۂ درد (۵) آہ سرد (۶) دردِ دل (۷) شمع محفل (۸)
واقعات درد وغیرہ (۹) حرمت غنا (۱۰) دیوانِ فارسی (۱۱) دیوان اُردو -
رسالۂ اسرار الصلوۃ اسم با مسمی ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا
بیان ہے - رسالۂ واردات اُنتیس برس کی عمر میں ۱۱۷۲ھ میں تصنیف فرمایا -
اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کیے گئے ہیں علم الکتاب اسی رسالۂ واردات
کی شرح ہے - جسکو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثر کی فرمائش سے تصنیف
کیا - اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی - احادیث
نبوی اور اقوال سلف سے ثابت کیا ہے - اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا
اس میں بیان ہے - نالۂ درد ۱۱۹۰ھ میں اور آہ سرد ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئیں
یہ رسالے بھی روحانیات اور مسائل تصوف پر ہیں شمع محفل اور صحیفۂ واردات،
یہ دونوں کبرسنی کی تصنیفات ہیں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی - حرمت غنا اور
واقعات درد میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے - اول الذکر میں غنا کی حلت و
حرمت سے بحث کی ہے - دیوان فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے
جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں - آخری چیز
دیوان اُردو ہے جسکو اُردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیئے
دیوان اُردو کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورۂ بالا فارسی میں ہیں - دیوان کا ایک
نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمن خاں صاحب
شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا ہے - خواجہ صاحب کی زبان

اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے۔ عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کیے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزا دیتی ہیں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے اعتبار سے اُن سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بقول مصنف "آبِ حیات" تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔ یا بقول امیر مینائی مرحوم پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پُرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر اس خوبصورتی سے کہ اُن سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو وہ بوالہوسی سے تعبیر کرتے تھے اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ مثل خواجہ حافظ اور اساتذۂ سلف کے اُن کا معشوق بھی کوئی بازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اُس سے معشوق حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اُس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسب مال و جاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت عالیشان اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف آبحیات "چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں" باقی رکن۔ میر۔ سودا۔ اور مظہر ہیں۔ حقیقت میں انھیں عناصر اربعہ کی

ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہوئی اور منجھی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہونچ گئی۔ خواجہ صاحب کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اُسمیں چار چاند لگا دیے۔ خواجہ صاحب کا یہ اثر اُن کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پر بھی بہت تھا۔ اُن کے معاصر شعرا اُن کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستانِ سخن۔ عندلیب خوشخوان چمن ابن فن زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شام مدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوشنما ۔ ۔ ۔ ۔ خلیق متواضع آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید اما بیشتر رباعی۔ گرمی بازار وسعت مشرب او ست غرض از آشنائی مطلب او ست متوطن شاہجہاں آباد۔ بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرہ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص است اگرچہ حسن سلوک عام سر حسن سلوک بپاے خود گرفتہ اعتزاز را از گوشۂ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتداے عالم است۔ ایامی کہ فقیر بخدمت آن بزرگوار شرف اندوز می شد۔ از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد ۔ ۔ ۔ مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روزگار بیمدار برہم خورد از بسکہ باین احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین کنید بہتر ست۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد۔ خدایش ابدالآباد سلامت دارد" میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اُن کے شاگرد تھے

چنانچہ فرنچ مستشرق اور زبان اُردو کے دلدادہ گارسن ڈیٹاسی کو بھی یہی دھوکا ہوا۔ کہ وہ میر کو درد کا شاگرد بتاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب اُن کے تقدس اور کمال عرفان اور نیز اُن کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میرحسن کا بھی ہے۔ وہ بھی اُن کی بزرگی کے قائل اور اُن کے کلام کے معرف اور دلدادہ تھے۔ کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے" ہماری رائے میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میرحسن خواجہ صاحب کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

**شاگرد** خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۲ھ اور مصحفی ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو ۹۴-۱۷۹۳ء کے مطابق ہے۔ یہی وہ سن ہے جسمیں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیٹاسی اور لائل صاحب مصحفی کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھیاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب جس سے سن وفات ۱۱۹۹ھ اور عمر اسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف کے طور پر مجھکو معلوم ہوا کہ میری عمر چھیاسٹھ کی ہوگی سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھیاسٹھ سال اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے

درد کی شخصیت اُردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین پہ اور نیز بعد کی نسلوں پر اُن کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا تصوف کے رنگ میں وہ بے نظیر اور بیمثال ہیں۔

**میر سوز**
**۱۱۳۳ھ تا ۱۲۱۳ھ**

سید محمد میر نام میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ مگر خود میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق۔ شہزور اور ورزش کے بڑے شائق تھے۔ فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ۔ نستعلیق۔ شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگیں طبع اور عاشق مزاج تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی اور لوگ بیحال تھے تو یہ دولت فقر سے مالا مال صوفی باکمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب مہربان خاں رند دیوان نواب احمد خاں غالب جنگ کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اُس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر ان کا جی نہ لگا۔ چند دن ٹھہر کر مرشد آباد کا رُخ کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ کا دَور دَورہ تھا وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخر کار اُسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ اُن کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُستاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۰ھ میں بعمر ۸۰ سال رحلت کی۔ مگر لطف سنہ وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں اور مصحفی بوقت وفات ستر برس کا سن لکھتے ہیں۔ نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسّی سال اور مقام وفات

ٹھہرتا تے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۱۳ھ وفات اور عمر ۷۰ سال لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زبان۔ خلیق۔ ملنسار اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرز کلام | کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جسمیں غزلوں کے علاوہ مثنوی رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ اور بے تکلف زبان میٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان۔ صفائی محاورہ اور بیساختہ پن میں ان کا کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ تکلف و آورد فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبیعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ اُن کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے اُن کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں سیدھے سادھے ہندی لفظ بیساختگی سے باندھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔ شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اُس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت اُن سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ اِن کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرز ریختی کے نام سے بعد کو سعادت یار خاں رنگین نے ایجاد کیا۔ اُسکی ابتدا سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا

سب سے علیحدہ تھا۔ ترنم اور خاص درد و اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہار مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے آبحیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ؎

| | |
|---|---|
| گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے | سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے |
| وہاں دیکھے کئی طفل پری رو | ارے رے رے ارے رے رے ارے رے |

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھکر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در عہد خود از جملہ اوابنداں ممتاز طرز ادائیکہ ملک اوست۔ دخواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندنش چناں خوب مینماید کہ در گفتن نمی آید" مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ موے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے اُن سے کچھ ناراض ہیں فرماتے ہیں "ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من لطف دلم از دخوش است"

سوز کا مرتبہ شاعری میں

سوز کا مرتبہ اُردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جا سکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے استاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی، اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر، تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

**سودا**

سنہ ۱۱۲۵ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ

سنہ ۱۷۱۳ء سنہ ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اُردو کے خاقانی و انوری۔ سپہر شاعری کے درخشندہ تارے۔ بلکہ آفتاب۔ اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن۔ میر کے ریختہ گویوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔ مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سر آمد شعرائے ہندوستان مرزا رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد تذکرہ آبحیات میں تاریخ ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے۔ تخلص کے انتخاب کی وجہ بھی آبحیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں "کہ تخلص سودا اس واسطے رکھا گیا کہ سودا یا جنون تمغائے عشق ہے جس پر ایشیائی شاعری کا دار و مدار ہے۔ اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا کہ اُس کے جزو اول میں لفظ سودا داخل ہے" اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اُس سے مرزا کی اُستادی پر فخر و مباہات

ثابت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔
مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرف تلمذ نہ تھا مگر اُن کی صحبت سے بہت
فیضیاب ہوے اور شعرگوئی میں بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ اُنھیں کی ہدایت کے
موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق اُن میں اسقدر
سرایت کئے ہوے تھا کہ اُس سے بالکل علٰحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے
چنانچہ اُن کا مکمل دیوان فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام
اسقدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچۂ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو
اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُن کا کلام اُن کی زندگی ہی میں مشہور ہوگیا تھا۔
اور وہ مُسلّم الثبوت شاعر اُسی وقت مانے جاتے تھے۔ اُن کی اُستادی کا چرچا اسقدر
پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی اُن کی شاگردی کا شوق ہوا۔ وہ اُردو اور
فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ آخرکار مرزا کے شاگرد ہوے
اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی
خاص بات پر رنجش ہوگئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دہلی میں بہت سے ایسے
قدردان رئیس و امیر موجود تھے جنھوں نے استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا
فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے
قدرشناسوں کی دریادلی اور قدردانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا
کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سن کر اُن کو نہایت شفقت و
محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زادراہ بھی بھیجا تو مرزا نے ٹال دیا اور کمال استغنا
سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی ؎



سودا

| | |
|---|---|
| آوارہ ازیں کوچہ بآں کوکب تک | سودا پئے دُنیا تو بہر سو کب تک |
| بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک | حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے |

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا۔ دلی کی حالت بدل گئی۔ وہ پُرانا وقت نہ رہا۔ پُرانے قدردان یکے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پُرانے شرفا کے گھرانے آئے دِن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشاں ہوگئے اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی اور وہ قدرداں اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعراے باکمال نے دلی کو خیرباد کہا مرزا بھی اُسی نازک وقت میں اُس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریبًا ساٹھ برس کی تھی۔ فرخ آباد پہونچے۔ نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ بر سر حکومت تھے۔ مہربان خاں رِندؔ اُن کے دیوان تھے جو اہل علم و کمال کے قدرداں خود بھی شاعر تھے اور بقول میر حسن میر سوز و میرزا سودا سے تلمذ تھا۔ چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ اُنھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں مر گئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سریرآراے سلطنت ہوے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکین سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اُس کا تصفیہ نواب سعادت علیخاں نے

جو اُس وقت ولیعہد سلطنت تھے نواب کے روبرو مرزا کی موافقت میں کرادیا۔ سابق کی شکر رنجی جاتی رہی۔ خطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پُر لطف صحبت اور اُن کی بذلہ سنجیوں کو جملہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے۔ مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں مصحفی۔ منت، ناسخ، نساخ کی تاریخیں مشہور[۱] رہیں

**تصانیف** مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جسمیں ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تاریخیں، مخمس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد۔ تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے

(۴) چوبیس مثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں اُنکی دلچسپ اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین بر کلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہیں)

(۶) قصائد اُمرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

[۱] ایک تاریخ یہ ہے ۔ غلہ کو جب حضرت سودا گئے ÷ فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا ÷ بولے تصنعت دُور کر بلے عناد ÷ شاعرانِ ہند کا سرور گیا ÷

(۸) قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔
(۹) ایک رسالہ نثر میں موسوم بعبرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب ہے جو انھوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کیے تھے۔
(۱۰) میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کا ترجمہ نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہے)۔
(۱۱) ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا جواب نہیں ملتا۔

**سودا کا مرتبہ شاعری میں**

سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے اُستاد مانے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور اُنکے بعد بھی اُن کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ اُن کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں اُن کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

**اُن کی خدمات زبان کے ساتھ**

مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کرکے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اُس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی | سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے |
| بسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر | جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے |

ولہ

| | |
|---|---|
| سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا | پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے |
| کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال | یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے |

شاعری کی صناعیوں سے اُس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل، اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کیے اور اس اُستادی سے داخل کیے کہ اُس کے جزو ہو گئے اور اُسکی وسعت اور لوچداری اِتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ ہر ادبی کام اُس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کئے جس میں سے بعض تو مقبول ہوے اور بعض کو آیندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر اِن خدایانِ سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ بجاے اجنبی الفاظ کے کثرت سے داخل ہوے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں اُن پر طغراے قبول فوراً ثبت ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابل داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے۔ مثلاً الفاظ جھبل۔ پربت۔ رائی وغیرہ اور ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری۔ کنھیا کا عشق وغیرہ جو اُن کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں[1]۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم

---

[1] محبت کے کردن جھبل کی ہیں تعریف کیا یارو
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اُسکو نہ دیکھا ہو
ترکش الیندھ سینہ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

ستم پربت ہو تو اُسکو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی
کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہر جائی

اُس زمانہ میں مادر وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعرائے اُردو کے دل میں بہت کچھ تھا۔ جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے۔ اور اس کوشش میں اُن کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اُٹھانا پڑیں۔ مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دو ہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا چنانچہ سودا خود فرماتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
مُنکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور اُن کے ہمعصر میر کہتے ہیں۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی دقت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منازل ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے جانچنا بہت ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر اُنھیں حاصل تھی اُس کا اعتراف اُن کے معاصرین مثلاً میر، و میر حسن، مصحفی، وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت و کمال کی دل سے داد دی ہے۔

| | |
|---|---|
| خدمتِ شاعری کے ساتھ | جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں اُنھیں پر سودا نے |

اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا ۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجد بھی تھے یعنی قصیدہ اور ہجو ۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور ناکمل حالت میں موجود تھیں مگر انھوں نے یہ کمال کیا کہ اُن کو اُردو میں درجۂ کمال تک پہونچا دیا ۔ اور ایسا کر دیا کہ اُن کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لیے محال ہو گیا ۔ ہر چند کہ اکثر شعرا نے اُن کی پیروی کی اور اُن کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں متفرد ہی رہے ۔

**قصیدہ و مرثیہ** اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی اُستادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکۃ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں ۔ نزاکت خیال اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوے سبقت لے گئے ہیں یہی حالت اُن کے مراثی کی بھی سمجھنی چاہیئے ۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اُردو میں بہت گزرے ہیں مگر اُن کے کلام میں سوائے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ ، کوئی جدت اسلوب ، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھلی معلوم ہو ۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد ہیں جنھوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے ۔

**ہجو** مرزا صاحب نے ہجوؤں کے دفتر کے دفتر لکھکر رکھ دیے ہیں ۔ اُن لوگوں کو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آرے چلے ہونگے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابدالآباد تک شاداب و سرسبز رہیگا ۔ اُن کے

اہاجی میں وہ گرمئی کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہیں معلوم ہوتا ہے اس صنف سے اُن کو خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

کی ہجو ہر اک شخص کی ہر چند کہ اُس نے
بر اُس سے طرف اُس کے نہ عائد ہوئی تقصیر

ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مُغل تھا
اور جتنے بزرگ اُس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی اُن کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آجاتی تھی اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے آن بن ہوئی فوراً اُن کا غلام "غنچہ" قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ گل بوٹے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھکر لوگ اپنی آنکھیں اور سُن کر اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے اس بتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ "جس طرح رومتہ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جووینال ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اُسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سودا کی اُن پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں اُنھوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعۂ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارتگری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پُر آشوب حالت اور اُمرائے دہلی کی

؎ دیکھو فٹ نوٹ صفحہ (۱۳۷)

تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان نہایت پُرزور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدامنی اور کوتوال شہر کی کم زوری کس پُر مذاق اور مؤثر طریقہ سے بیان کی ہے" یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجویں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے یہاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بنگئی۔ میر حسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین، بقا اور اِن کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آئے اور اُن بیچاروں نے حرکت مذبوحی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر اُن کا کہا کسی نے نہ سنا۔ مرزا کا کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کثرت اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اِس میں اُن کو بڑا مزا آتا تھا۔ اِن کی ہجویں کچھ معمولی نقلیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے اُن کی قوت بیان، قدرت زبان، اور معاملات دُنیاوی میں اُن کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اُس چیز کی جزئیات کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درد و اثر اور تمسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں اور سُننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے۔ جس چیز کا خاکہ اُڑاتے ہیں اُس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور پھڑکا دینے والے ہوتے ہیں۔

مزا میں جووینال والٹیر اور سوئفیٹ تینوں کا مزا ہے۔ ایڈیسن کی متانت اُن میں مطلق نہیں۔ اُن کی ہجو میں پھکڑپن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے۔ اُن کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی تہ میں ایسی کاٹ اور تُرش ہے جو دل کے اندر

لہ "جولیس جووینالس" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا۔ سنہ پیدائش تقریباً ۷۰ عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی۔ ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشا دمیں کمال رکھتا تھا۔ اُسکی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں ہجو کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ زمانہ کی سوسائٹی کی بداخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زد در دار زبان میں ہیں جسکے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

لہ پورا نام "فرانسوئے ماری والٹیر" فرانس کا مشہور شاعر ڈرامانویس اور ناقد گزرا ہے ۱۶۹۴ء سن ولادت اور ۱۷۷۸ء سنہ وفات۔ فن شعر اور تنقید میں یکتائے زمانہ تھا۔ مرزا غالب کی طرح اُس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں اُسکے کلام میں ذہانت و طباعی اور انتہا درجہ کی طعن آمیز شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ مذہب کے ساتھ اُسکی بے پروائی، شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں۔ اُسکا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

لہ "جاناتھن سوئفیٹ" والٹیر کا معاصر ہے۔ مشہور آئرش افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا۔ برخلاف والٹیر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا "بیٹل آف دی بکس" (کتابوں کی جنگ) اور "گلیور کے سفر" اُس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ اُسکی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئرلینڈ کے قصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اُس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام معقول تجویز رکھا جسمیں تجویز تھا کہ آئرلینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے اُن کا گوشت بازار میں بیچا جائے۔ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے۔ عبارت نہایت صاف وہ بلا کسی تصنع کے لکھتا تھا جسکی وجہ سے اُس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں ۱۲

لہ جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور نثار گزرا ہے اُسکی مشہور کتاب "اسپکٹیٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی۔ اور معاشرتی مضامین کا ہے جنکی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے۔ وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اُس سے کسی کا دل نہیں دکھتا۔ اُس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سوئفیٹ کے جسکے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے ۱۲

اُتر جاتی ہے۔ آزاد نے سچ کہا ہے کہ "جس کے پیچھے پڑتے تھے اُس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا"۔

**کلام پر رائے** مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکومت حاصل تھی۔ مشکل سے مشکل زمینیں اُن کے سامنے پانی اور ادق مضامین اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست، بندش چُست، زوائد و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بھول جائے تو دوسرا لفظ اُسکی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ اِدھر سے اُدھر رکھدو تو شعر کا لُطف اور مزا جاتا رہے گا۔ کلام ٹھوس اور زور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحریں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہہ گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر سے چشمہ نکلتا ہے۔

**سودا کا اثر بعد کے شعرا پر** مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پر بہت کچھ پڑا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادّہ پیدا ہوگیا۔ اِس خاص صفت کے اعتبار سے اُن کو اُردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسپنسر[1] کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے معاصرین سے قطع نظر غالب اور ذوق وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور اُن کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے

---

[1] اڈمنڈ اسپنسر سولھویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے اُسکی کتاب فری کوئن (پری ملکہ) ایک مشہور نظم ہے۔ اُس نے قدیم لاطینی اور یونانی بحریں نظم انگریزی میں رواج دیکر انگریزی شاعری کا پایہ بلند کیا۔

ناسخ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سودا کا قائل ہے اور اُستاد ذوق کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے علی الخصوص اُن کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اسقدر مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اُس کو پڑھتا ہے اور اُس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعراے اُردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی[۱] اور کیٹس[۲] کے یہاں بہت کچھ ہیں۔ غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض اُس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہونچ جائے۔ سودا کی اُستادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری اُن کے خمیر میں پڑے تھے میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص اُن کو پورا شاعر مانتا ہے

---

۱؎ سو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا نہایت شگفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اسکی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اُسکی تصانیف میں کوئن میب (ملکۂ میب) الاسٹر (کنج تنہائی)، اور ریوولٹ آف اسلام مشہور ہیں اُس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲

۲؎ شیلی کا معاصر تھا اور مثل اُسی کے نوجوان مرا۔ اُسکی کتاب "انڈائمین" نہایت دلچسپ ہے۔ نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا۔ خود نہایت حسین اور حسن کا عاشق تھا ۱۲

اور اُن کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر و باہر ہے کہ اُن کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آبداری اور انعکاس اور اُن کا دماغ اعلیٰ تخئیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو اُن کے کلام کو جملہ شعرائے ماضی وحال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت۔ جس سے کلام کا زور مضمون کی لطافت اور نزاکت سے مِل کر عجب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اُسمیں تلوار صفاہانی کی سی آبداری پیدا ہو جاتی ہے نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ اِدھر اُدھر ہو جائے تو شعر بیمزہ بلکہ مہمل ہو جائے گا۔ صنعت کی خوبی سے صناع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے۔ اُن کا سامان زینت شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی۔ جو بات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنبش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخئیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیۂ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیز وسیع کیا اُن سب میں مرزا کا نمبر اول ہے۔ بقول مصنف آبحیات جس طرح کیمیاداں دو مادوں سے تیسرا مادہ تیار کرتے ہیں اُنھوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے

مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں۔

اب بے موقع نہوگا کہ مرزا صاحب کے متعلق اُن کی اور نیز اُن کے بعد کے شعرا اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں اُن کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود اُنھیں کی زبان سے سُنیئے "مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے است خوش خلق و خوشخو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رو۔۔۔۔ غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گوست۔ ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعۂ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ۔ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدۂ در ہجو اسپ گفتہ موسوم بہ تضحیک روزگار دور از حد مقدور در صنعتہا بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگار ست حق تعالےٰ سلامتش دارد"۔

اسی طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ "سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اِس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں ہے" اس تنقید پر مصنف آبحیات کی رائے ہے کہ "مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے اُلجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو

اور نیز محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے" اسی طرح صاحب طبقات الشعرا مرزا کے قصائد کو عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور اُن کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پرگو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مرزا سودا کے مقابلہ میں ابتک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اُٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیر اُن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں" حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "مرزا محمد رفیع سرآمد شعراے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہونچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے" تذکرۂ گلشن بیخار میں ہے کہ "فقیر کی دانست میں اُن کی غزلیں اُن کے قصیدوں سے اور اُن کے قصیدے اُن کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد اِن سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ اُن کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس راے کی قباحت ظاہر ہوجائے گی" پروفیسر شہباز شمس العلما نواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سودا اردو کے شکسپیر تھے۔ اسی طرح سر الفرڈ لائل سودا کو زبان اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

**کلام میں کمی** مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) اُن کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا اُن کے اکثر ہمعصروں میں بہت زور تھا

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲)
دوسرے لطف غزل اُن میں کم ہے یعنی اُن کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور سبکی ا
سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حا
میں آئے گا جہاں اِن دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء | میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن۔ میر غلام حسین
ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس
ہوئے جو فلک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ اِن کے اجداد شہر ہرات کے
مشہور خانوادۂ سادات سے تھے۔ جدِ اعلیٰ میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں
مستقل سکونت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جید فاضل اور مشہور خوشنویس تھے
اور اِن کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں میں قدر کی نگاہ سے
دیکھے جاتے تھے اُن کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار
آدمی تھے۔ جیسا کہ اُن کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پُرانی دِلّی
محلہ سید واڑہ میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل
اور کلام بھی انھیں کو دکھایا اُس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی
تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک
ڈیگ میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصل
حال اپنی مثنوی گلزار ارم میں قلمبند[1] کیا ہے۔

[1] گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے۔ اس مثنوی کا ایک نہایت صحیح اور خوشخط نسخہ کتبخانہ ندوہ میں ہے۔ دہر زندگو گا

فیض آباد میں پہونچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے۔ جب نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۵ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت ہوگیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کرکے یہیں ماہ محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال[۱] کیا۔ بروقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ ۱۲۰۱ھ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی

میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کا "تذکرہ شعرائے اردو" جو نہایت اعلی درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں "جوان اہلے ست نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد وضع مرد آدمیانہ می دارد۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند" میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں "اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہ سرانجام نیافت۔ بقدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودہ ام" اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے اور تینوں اصحاب مذکورۂ بالا کی پیروی کرتے تھے۔

[۱] عقب باغ نواب قاسم علی خان محلہ مفتی گنج (لکھنؤ) میں مدفون ہیں (تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد ۲)

اور ممکن ہے مشورۂ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف اُن کے خلاف لکھا ہے۔

**طرزِ کلام** کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غزل، رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور مثنوی "سحر البیان"، معروف بہ "مثنوی میر حسن" اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُن کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں۔ وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

**میر حسن کے صاحبزادے** میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر محسن محسن۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خلق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کہتے تھے۔ خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن۔ ترکیب بند۔

مخمس، واسوخت، مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے۔

(۲) گیارہ مثنویاں جس میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں۔

(۱) مثنوی سحرالبیان یا قصۂ بےنظیر و بدر منیر۔ لاجواب اور بے عدیل و بےنظیر مثنوی ہے۔ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نامی پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادۂ بےنظیر اور شاہزادی بدر منیر کے عشق کا افسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس، زیور، شادی بیاہ کے رسوم، برات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اسقدر صاف اور بامحاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اُس کا ہر مصرع لاجواب اور ہر شعر انتخاب ہے۔ صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون، قابل دید ہے سوال جواب کی نوک جھونک، پرلطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جنکو پڑھ کے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور اِن سب پر طُرّہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں "کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آب ہم تم بول رہے ہیں" قصّہ پُرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص مسمّٰی میر بہادر علی نے ۱۲۱۸ھ میں کیا تھا جس کا نام نثر بےنظیر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر

ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کرکے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصہ بآسانی سمجھ میں آجائے

## اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر ایک اولاد کا تھا اَلَم
وزیروں کو اِک روز اُس نے بُلا — جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال — فقیری کا ہے میرے دِل کو خیال
وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب — نہ ہو ذرّہ تجھ کو کبھی اضطراب
یہ دُنیا جو ہے مزرعِ آخرت — فقیری میں ضائع کرو اُس کو مت
مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم — سو اِس کا تردّد بھی کرتے ہیں ہم
بُلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو — نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
بُلا کر اُنھیں شہ کنے لے گئے — جونہی روبرو سب وہ شہ کے گئے
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دَیا — چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا
یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں — خطر ہے اسے بارھویں سال میں
نہ آئے یہ خورشید بالاے بام — بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ — رہے برج میں یہ مہِ چاردہ
گئے نو مہینے جب اُس پر گذر — ہوا گھر میں شہ کے تولّد پسر
ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر — رکھا نام اُس کا شہِ بےنظیر

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی — کھلی گلپھڑی غم کے جنجال کی
کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام — کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا نہا دھو کے تیّار ہو
نہا دھو کے نکلا وہ گُل اس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح
غرض ہو کے اس طرح آراستہ — خراماں ہوا سروِ نو خاستہ
گھڑی چار تک خوب سی سیر کر — رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر
اُسی کثرتِ فوج سے ہو سوار — پھرا شہر کی طرف وہ شہریار
قضارا وہ شب تھی شب چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ بچھّے پلنگ
خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی — کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی
اِرادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا
کہا شہ نے اب تو گئے دِن نکل — اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل
قضارا وہ دِن تھا اُسی سال کا — غلط وہم ماضی میں تھا حال کا
زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا
قضارا ہوا اِک پری کا گذر — پڑی شاہزادے پر اُسکی نظر
ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پر نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار
محبت کی آئی جو دل میں ہوا — وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا
قضارا کھلی آنکھ اُس گل کی جو — نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا ‌ ‌ تعجب سے اِک اِک کو تکتا رہا
اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں ‌ ‌ لگا کہنے یارب میں آیا کہاں
سرہانے جو دیکھی مہ چار دہ ‌ ‌ کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک مہ
کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر ‌ ‌ لے آیا مجھے کون گھر سے اِدھر
پھرا منھ کو لے اور اُدھر سے نقاب ‌ ‌ دِیا اُس پری نے یہ ہنس کر جواب
خُدا جانے تو کون میں ہوں کہاں ‌ ‌ مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں ‌ ‌ پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں
چُھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار ‌ ‌ یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار
پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے ‌ ‌ یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے
غرض دل کو جوں توں لگا یاں وہاں ‌ ‌ کہا اُس نے جو کچھ کہا اُس کو ہاں
ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس ‌ ‌ رہے وحشیوں کی طرح وہ اُداس
وہ تھی نازنیں بھی بہت عقلمند ‌ ‌ نہ کُھلنے سے کچھ اُسکے ہوتی تھی بند
غرض ماہ رُخ اُس پری کا تھا نام ‌ ‌ پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام
کہا ایک دِن اُس نے اے بے نظیر ‌ ‌ مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
تو رُک رُک کے کر اپنے جی کو نہ بند ‌ ‌ نہ پہُنچے کہیں تیرے جی کو گزند
یہ گھوڑا تو کل دونگی کل کا تجھے ‌ ‌ ولیکن یہ دے تو مُچلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں ‌ ‌ دیا دِل کسی سے لگائے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہگار کا ‌ ‌ وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول ‌ ‌ مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول

یہ گھوڑا جو اُس گل کے تھا نجش کا — فلک سیر تھا نام اُس رخش کا
سرِ شام وہ بے نظیرِ جہاں — اُسی رخش پر ہو کے جلوہ کناں
ہر اِک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ — وہیں اِک پہر سیر کرتا تھا وہ
پھر جبکہ بجتا تو پھرتا شتاب — کہ پھر قہر تھا ماہ رخ کا عتاب
سُنو ایک دِن کی یہ تم واردات — اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اُس کا اک جا گزر — سہانا سا اِک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ — اُترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اُس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے اُتر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اُترا دبے پاؤں وہ — نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ — چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
رلی جنس کی اپنے جو اُس کو بو — لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو
عجب صورتیں اور طرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
گئی اُس کے عالم پہ جب دم نگاہ — اور آئی نظر اُس میں اک رشک ماہ

برس پندرہ ایک کا سِن و سال
نہایت حسین اور صاحب جمال

دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے
سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے

خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام
ستاروں کا جوں ماہ پر اژدہام

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اُسنے کمال
کہا شاہزادے نے یا ذا الجلال

درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں
کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں

جو دیکھے تو ہے اک جوانِ حسیں
درختوں کی ہے اوٹ میں مہ جبیں

کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن
کسی نے کہا ہے قیامت کا دِن

یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں
اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں

گئے بات پر شاہزادی کے گوش
یہ سنتے ہی جاتا رہا اُس کا ہوش

کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اُٹھی
گیا سننا جی تو رَہ کر اُٹھی

خواصوں کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ
عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ

جو دیکھیں تو ہے اِک جوان حسیں
کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دِن

ولے عشق کی تیغ کھائے ہوئے
کڑا دل کسی پر لگائے ہوئے

گئی اُس جگہ جب کہ بدرِ منیر
اور اُس نے جو دیکھا شہِ بینظیر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مِل
نظر سے نظر جی سے جی دل سے دِل

غرض بینظیر اور بدرِ منیر
گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر

تھی ہمراہ اِک اُس کی دختِ وزیر
نہایت حسین اور قیامت شریر

شتابی سے لا اُس نے چھڑکا گلاب
تب آئی تنوں میں ذرا اُن کے تاب

وہ اُٹھنے تو اُٹھی پہ حیران سی
گلِ شبنم آلودہ گریان سی

چلی اُس کے آگے سے منہ موڑ کر
وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر

غضب منہ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں
میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں
چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں

کہ اِتنے میں آئی وہ دختِ وزیر
لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر

مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے
مثل ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے

ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب
یہ ہے وارداتِ غریب و عجیب

شتابی سے مجلس کو تیار کر
تو اِس گل سے گھر رشکِ گلزار کر

بُلا لائی جا اُس جواں کے تئیں
کیا میزباں میہماں کے تئیں

---

بلا اِک مکاں میں بٹھایا اُسے
محل کا سماں سب دکھایا اُسے

کھُلا بند جس دم درِ گفتگو
جواں نے حقیقت کہی مو بمو

پری کا بھی احوال ظاہر کیا
چھپے راز سے اُس کو ماہر کیا

کہا اِک پہر کی ہے رخصت مجھے
زیادہ نہیں اِس سے فرصت مجھے

رہی دِل ہی دل میں غرض دل کی بات
پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات

خبر رات کی سُن اُٹھا بینظیر
کہا اب میں جاتا ہوں بدرِ منیر

اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا
تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا

بندھا پھر تو معمول اُس کا مدام ۔ کہ ہر روز آتا اُدھر وقت شام
پہر رات تک ہنسنا اور بولنا ۔ درِ عشق اور حُسن کو کھولنا
کبھی ہجر سے اُن کو ہونا ملول ۔ کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
کسی دیو نے دی پری کو خبر ۔ کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
یہ سُن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی ۔ لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی ۔ ہوئی دشمن اب اُسکی میں جان کی
کہا دیو سے تو مجھے دے پتا ۔ کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
کوئی نازنیں سی تھی اِک اُسکے ساتھ ۔ کھڑی تھی دیئے ہاتھ میں اُسکے ہاتھ
قضارا اُڑا میں جو ہو کر اُدھر ۔ یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
یہ اُڑتی سی سُن کر خبر وہ پری ۔ کہا دیکھنے پاؤں اُس کو ذری
غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو اِدھر ۔ کہ اِتنے میں آیا وہ رشکِ قمر
بلا سی وہ دیکھ اُس کے پیچھے پڑی ۔ کہا سُن تو اے موذی و مدّعی
تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا ۔ کہ اُس مال زادی کو جوڑا دیا
مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا ۔ جھنکاتی ہوں کیسے کنویں رہ بھلا
یہ کہہ اور بُلا اِک پریزاد کو ۔ کہا سُننا اِس کی نہ فریاد کو
اِسے کھینچتا یاں سے لیجا شتاب ۔ وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب
کنواں اُس میں جو ہے مصیبت بھرا ۔ کئی من کا پتھر ہے واں پر دھرا
اِسے جا کے اُس چاہ میں بند کر ۔ وہی سنگ پھر اُسکے مُنہ پر تو دھر
سرِ شام کھانا کھِلانا اُسے ۔ اور اِک جام پانی پلانا اُسے

نہ دیکھیو سوا اِس کے گر کچھ کہے — یہی اُس کا معمول دائم رہے
کیا بند پھر جا کے اُس چاہ میں — کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں
پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر — پڑی بے قراری میں بدرِ منیر
کئی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ — نظر میں ہوا اُس کے عالم سیاہ
لگی کہنے نجم النساء سے بُوا — خدا جانے اُس شخص کو کیا ہوا
کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ — وہ معشوق ہے اُس کو پروا ہے کچھ
خدا جانے کس شغل میں لگ گیا — مری چڑ ہے اتنا بھی ہونا فدا
لگی کہنے تب اُس کو بدرِ منیر — کہ سُنتی ہے اے میری دختِ وزیر
مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر — پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر
نہ باندھا ہو اُس کو کسی شید میں — کیا ہو نہ اُس کے تئیں قید میں
گئی منڈ کری مار آخر کو لیٹ — چھپر کھٹ کے کونے میں مُنہ کو لپیٹ
ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں — تو دیکھا بہت اُس کو جنجال میں
قضا نے دکھایا عجب اُس کو خواب — کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق — کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق
نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے — فقط اک کفِ دست میدان ہے
مگر بیچ میں اُسکے ہے اک کنواں — کہ اُٹھتا ہے آہوں کا وانسے دھواں
کنویں کا ہے منہ بند اُس سے اڑی — کئی لاکھ من کی سِل اُس پر پڑی
صدا واں سے آتی ہے بدرِ منیر — ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
میں بھولا نہیں تجھ کو لے میری جاں — کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قیدِ گراں

یکایک گئی آنکھ اِتنے میں کھُل
پڑے اشک رخسار پر اُس کے ڈھل

سُنا جب کہ نجم النسا نے یہ حال
ہوئی بیقراری تب اُس کو کمال

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا
ترے واسطے میں نے یہ دُکھ سہا

بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں میں
اُسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں میں

کہا شاہزادی نے سن اے رفیق
ہوئی میں تو اس چاہِ غم میں غریق

بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو
کہ وہ ہے پری اور انسان تو

کہا اُس نے کیا کیجیئے اب بھلا
پڑی اب تو ہے اپنے سر پر بلا

تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں

یہ کہہ اُس نے رُو رُو اُتارا سنگار
کیا اپنی پشواز کو تار تار

پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش و حواس
سجا تن یہ جوگن کا اُس نے لباس

چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں

جُدا ہو کے القصہ رو توں کو چھوڑ
چلی اپنے گھر بار سے مُنھ کو موڑ

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

لئے بین پھرتی تھی صحرا نورد
تنِ چاک چاک اور رُخِ زرد زرد

قضارا اُٹھا نا سا اِک دشت تھا
کہ اِک شب ہوا اُسکا واں بسترا

وہ تھی اتفاقاً شبِ چاردہ
ادا سے وہ بیٹھی تھی واں رشکِ مہ

بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین
دو زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین

کِدارا بجانے لگی شوق میں
لگی دست و پا مارنے ذوق میں

بندھا اُس جگہ اس طرح کا سماں
صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں

یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ ‌ ‌ ‌ اُس اوپر مزا تم سنو اور یہ
کہ تھا اِک پری زاد فرخ سیر ‌ ‌ ‌ جنوں کے وہ تھا بادشہ کا پسر
ہوا پر اُڑائے ہوئے اپنا تخت ‌ ‌ ‌ کسی طرف جاتا تھا فیروز بخت
وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیرِ ماہ ‌ ‌ ‌ اُسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
یکایک سُنی بین کی جو صدا ‌ ‌ ‌ وہاں تخت لا اپنا اُس نے رکھا
جو دیکھے تو جوگن ہے اِک رشکِ حور ‌ ‌ ‌ کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا یہ نور
نظر کرکے حُسن اُس کا غش کر گیا ‌ ‌ ‌ تعشق کے عالم میں بس مَر گیا
یہ سمجھا بنا دے کا کچھ بھیس ہے ‌ ‌ ‌ لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے
پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ ‌ ‌ ‌ لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ
وہ سمجھی کہ دل اُس کا آیا اِدھر ‌ ‌ ‌ کہ دل بھی تو رکھتا ہے دِل کی خبر
کہا ہنس کے جوگن نے ہَر بُول ہَر ‌ ‌ ‌ جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر
گیا بیٹھ آ سامنے رِیت میں ‌ ‌ ‌ ہوا کھیت یہ تو اُسی کھیت میں
بجاتی رہی بین وہ صبح تک ‌ ‌ ‌ یہ رو یا کیا سامنے بے دھڑک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اُسنے بین ‌ ‌ ‌ اُٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
پریزاد نے تب پکڑ اُس کا ہاتھ ‌ ‌ ‌ شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں ‌ ‌ ‌ وہ کہتی کہا کی نہیں رے نہیں
نہ مانا اور اُس نے اُٹھایا اُسے ‌ ‌ ‌ پرستان میں لا بٹھایا اُسے
یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لیے ‌ ‌ ‌ کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے
یہ جوگن جو ہے ایک صاحب کمال ‌ ‌ ‌ ذرا بین سُنیے اور اُس کے خیال

بہت آپ اُس سے اُٹھا دینگے حظ
بہت بین میں اُسکی پا وینگے حظ

کہا اُس نے بابا بہت خوب ہے
ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے

کہا آؤ جوگی جی بیٹھو اِدھر
کرو رَوشن اپنے قدم سے یہ گھر

بہت اُس کی تعظیم و تکریم کی
جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

غرض اِس طرح اُس کا معمول تھا
کہ اُس شاہ پریوں کی خدمت میں جا

بجا بین سب کو رجھاتی تھی وہ
پہر کے بجے گھر کو آتی تھی وہ

دلے کیا کہوں حال فیروز شاہ
کہ تھی دن بدن اُسکی حالت تباہ

نہ دُنیا کی اُس کو نہ دیں کی خبر
اُسی کے تصوّر میں آٹھوں پہر

غرض ایک دن بات یہ جان کر
لگا گھات پر اپنی وہ آن کر

نہ تھا اُس گھڑی کوئی ایدھر اُدھر
اکیلی پڑی جوگن اُس کو نظر

اکیلے اُسے دیکھ ہو بے قرار
گرا پاؤں پر اُسکے بے اختیار

گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ
تو کہنے لگی مُسکرا اُس کو وہ

کہ ہے آج کیا یہ خلافِ قیاس
گرا اِتنا کیوں ہو کے تو بے حواس

لگا کہنے رُو رُو کے فیروز شاہ
کہ بس بس یہی تو کہوگی نہ واہ

تمھاری سمجھ نے تو مارا ہمیں ٭
یہ باتیں نہیں ہیں گوارا ہمیں

کہا اُس نے کہہ تو شتاب اپنا حال
کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال

کہا تب پریزاد نے میری جاں
کہاں تک کروں راز اپنا نہاں

بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول
غلامی میں اپنی مجھے کر قبول

لگی ہنس کے کہنے کہ اِک طور سے
جو میری کہانی سُنے غور سے

مطالب اگر میرے برلائیے تو　　تو شاید مُراد اپنی بھی پائیے تو
کہا اُس نے پھر جلد فرمائیے　　جو کچھ آپ سے ہو بجا لائیے
کہا اُس نے یہ ہے مری داستاں　　کہ شہرِ سراندیپ ہے اِک مکاں
مَلِک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ　　کہ بیٹی ہے اِک اُس کی مانند ماہ
جہاں میں ہے بدرِ مُنیر اُس کا نام　　میں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مُدام
بنایا ہے اُسنے الگ ایک باغ　　کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ
جُدا باپ سے تھی وہ اُس جا مقیم　　سَدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم
میں نجم النِّسا اُس کی دُختِ وزیر　　ہمیشہ سے ہمراز تھی اور مشیر
ہوئی ایک دِن یہ عجب واردات　　کہ اک شخص وارد ہوا ایک رات
کہاں تک کہوں اُسکا قِصہ ہے دُور　　نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
گیا اُس پہ اِس شاہزادی کا دِل　　گئے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مِل
ولے اُس پہ عاشق ہوئی تھی پری　　محبت میں تھی اُسکے وہ بھی بھری
کہیں اُسکے آنے کی سُن کر خبر　　خدا جانے پھینکا ہے اُسکو کدھر
دیا قید میں اُس کو ڈالا کہیں　　کہ مدت سے اُس کی خبر کچھ نہیں
سُو میں کھوج میں اُس کے جوگن ہوئی　　یہاں تک تو پہونچی بروگن ہوئی
پریزاد آپس میں تم ایک ہو　　اگر تم ذرا کھوج اِس کا کرو
تو شاید مدد سے تمھاری مِلے　　تو پھر آرزو بھی ہماری مِلے
دِل آباد ہو جی کو آرام ہو　　تمھارا اسی کام میں کام ہو
کہا تب پریزاد نے ہاتھ لا +　　انگوٹھا دکھایا کہ اِترا نہ جا

یہ سن قوم کو اُس نے اپنی بُلا　　تقید سے سب کو سُنا کر کہا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرومت کمی　　کہ ہے اِک پرستان میں آدمی
جو تم میں سے لاوے گا اُس کی خبر　　جواہر کے دوں گا لگا اُس کو پر
ہوا ناگہاں ایک کا واں گزر　　جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
وہ روتا جو تھا نالۂ وآہ سے　　تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے
وہ چوکی پہ جو دیو تھے جابجا　　لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا
کہا ماہ رُخ کا ہے قیدی یہاں　　کنویں میں تڑپتا ہے اِک نوجواں
وہ تحقیق کر اور لے اُس کا بھید　　اُڑا شہر کو اپنے دیوِ سفید
کیا جاکے فیروز شہ کو سلام　　سُن آیا جو کچھ تھا سُنایا تمام
یہ بھیجا پھر اُس ماہرخ کو پیام　　کہ کیوں زیست کرتی ہے اپنی حرام
بنی آدموں کو تو چوری سے لا　　بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتا
بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال　　کنویں میں جسے تو نے رکھا ہے ڈال
گیا ماہرخ کو یہ پیغام جب　　ہوئی خوف سے وہ پریشان تب
کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی　　کہو اُس کو لیجائے یاں سے کوئی
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو　　کہ اُس کا پرستاں میں چرچا نہو
یہ سُن کر جواب اُس کا فیروز شاہ　　چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
الگ یوں لے آیا کنویں سے نکال　　کہ فوّارہ جوں آب کو دے اُچھال
وہ جیتا تو نکلا ولے اس طرح　　کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
یہ دیکھا جو احوال اُس کا تباہ　　تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ

بٹھا تخت پر اپنے اُس کو وہاں — لے آیا وہ بیٹھی تھی جوگن جہاں
رکھا تخت اِک جا پہ اُس کا چھپا — کہا پھر یہ جا کر کہ نجم النسا
چل اب تو کہ میں اُس کو لایا یہاں — یہ سُنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں
کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے — ذرا اُس کی صورت دکھا تو مجھے
کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو — کہ شادی بڑی ہے کہیں غم نہو
یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ — لے آیا وہ جوگن کو واں ساتھ ساتھ
گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور — دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور
جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی — کہا ہاں رے ہاں یہ وہی ہے وہی
یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی — بلا اُس کی لے لے کے گرنے لگی
وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اُٹھا بے نظیر — تو نجم النسا ہے یہ دخترِ وزیر
کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ — کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ
کہا تیرے غم نے دِوانا کیا — کہ عالم سے اپنے بگانا کیا
کہی سرگذشت اُس نے اسدم تلک — کہ اس طرح پہونچے ہو تم ہم تلک
کیا ایک دن تو اُنھوں نے مقام — چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام
وہ جوگن وہ فیروزشہ اور وہ ماہ — چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ
مُربّع نشیں تھی جہ بدرِ منیر — وہاں اُس کو لائی وہ دخت وزیر
بلائیں لگی لینے نجم النسا ؀ — لگی گرد پھرنے برنگِ صبا
گئی جب کہ خلوت میں بدرِ منیر — کہا میں لے آئی ترا بے نظیر
کہا کیونکہ لائی کہا اِس طرح — وہ سب کہدیا حال تھا جس طرح

ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں — اور اک اور بندھوا اُڑا لائی ہوں
کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا — درختوں میں اُن کو رکھا ہے چھپا
سو اب ایک کو جا کے لاتی ہوں میں — ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
یہ سُن شاہزادی ہنسی کھل کھلا — کہا کیوں اُڑاتی ہے نجمُ النسا
یہ سُن کر شتابی گئی وہ نگار — لیا جا کے آہستہ اُن کو پکار
چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں — وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں
غرض دیر تک مِل کے روتے رہے — جدائی کے داغوں کو دھوتے رہے
کہا شاہزادے نے احوال سب — کنوئیں میں جو گذرا تھا اُسیرِ تعب
اگرچہ ہر اِک وصل سے شاد تھا — ولے ہجر کا غم اُنھیں یاد تھا
یہ ٹھہرا کے نِکلے وہ دو ماہرو — کہ اس بات کو کیجئے ایک سو
وہ نجم النسا اور وہ بدرِ مُنیر — کچھ اک کر بہانا وہ دونوں شریر
رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے — کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے
نکل بینظیر اور وہ فیروز شاہ — کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ
کر اسباب سب سلطنت کا درست — پھر آئے اُسی جا یہ چالاک و چست
وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ — جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ
کیا نامہ یوں ایک اُس کو رقم — کہ اے شاہ شاہاں والے فخرِ جم
فریدوں مثال و سکندر نژاد — مُرادِ جہان و جہان مُراد
میں وارد ہوں یاں ایک مہمان غریب — لے آئے ہیں مجھکو مرے یاں نصیب
نوازش سے اپنی کرم کیجئے — غلامی میں اپنی مجھے لیجئے

گیا یہ جو مسعود شہ کو پیام — سنا اور پڑھا خط کا مضموں تمام
لکھا نامہ اُسکے یہ اِک در جواب — کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
کہ نامہ تمھارا جو سربستہ تھا — وہ رازِ نہاں اپنے ہاتھوں کھُلا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں — تمھارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
ولے ہم کو ہے پاس شرعِ رسول — سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
سُنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید — ہوئی شاہزادہ کو گویا کہ عید
بُلا سنتکوں کو بتا سال و سن — مقرر کیا نیک ساعت کا دِن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان — پلا سب کو شربت دیے خاصدان
اُٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح — محل میں بُلانے کی ٹھہری صلاح
ہوا لیکن اُس وقت دُونا مزا — کہ دُولھا دُلھن جب ہوئے ایک جا
غرض اس طرح جب وہ دولھن کو بیاہ — لے آیا جہاں اُسکی تھی عیش گاہ
وہ نجم النسا تھی جو دختِ وزیر — گیا اُس کے والد کنے بینظیر
کہا باپ کو اُس کے اے خیرخواہ — مِرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اِک اِلتجا — کہ تو اُسکو فرزندی میں اپنی لا
غرض ہر طرح کر رضامند اُسے — کیا حال پر اپنے پابند اُسے
پریزاد تھا وہ جو فیروز شاہ — دِیا اُس کو نجم النسا سے بیاہ
پھرے دن تو اپنے وطن کو پھرے — وہ آشفتہ بُلبل چمن کو پھرے
خوشی سے لئے حرمت و جان و مال — چلے شہر کو اپنے وہ حال حال

| | |
|---|---|
| زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ | دوبارہ اُنھوں نے کیا اُن کا بیاہ |
| لکھوں گر میں اِس بیاہ کی دھوم دھام | تو پھر یہ کہانی نہ ہووے تمام |
| ہوا شہر پر فضل پروردگار | وہی شاہزادہ وہی شہریار |
| مرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیل | کہ ہیں شاہراہِ سخن کے دلیل |
| اُنھوں نے شتابی اُٹھا کر قلم | یہ تاریخ کی فارسی میں رقم |
| بگوشم زہاتف رسید ایں ندا | بریں مثنوی ۱۱۹۹ باد ہر دل فدا |
| میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور | اُنھوں نے بھی کی فکر از راہِ غور |
| کہی اُس کی تاریخ یوں برمحل | یہ بتخانۂ چین ہے سبے بدل |

(۲) دوسری مثنوی گلزارِ ارم ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلومہارڈ نے غلطی سے مثنوی سحرالبیان کے ساتھ خلط ملط کردیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے اور ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں تصنیف ہوئی اِس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحرالبیان کے اس میں بھی اُس زمانہ کے مختلف رسم ورواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں اِس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں کیا ہے۔

اِن کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں

انھوں نے کئی ہجویں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری - ہجو قصاب - نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجویں نہایت پُر لطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔

میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جنمیں سے سات قصیدے موجود ہیں میر صاحب موصوف قصیدہ کے مرد میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں -

**مراثی** چند مرثیے اور سلام بھی انھوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ اُن کے تذکرہ سے پایا جاتا ہے - اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانہ میں بخوبی ہوئی -

**تذکرۃ الشعرا** یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر اُن تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے[۱] اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی تھی مصنف نے اِس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے - پہلا دور اُن شعرا کا جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے - دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک ہوئے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا - بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعرا کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصّل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے - مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے اُن کا کلام نہایت سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور اُن کی مثنوی سحر البیان تو ایک معرکۃ الآرا

[۱] مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی تذکرۂ شعرائے اُردو کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ واضح رہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔

اور بےنظیر تصنیف ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

آخر میں کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

## مثنوی گلزار ارم سے

### لکھنؤ کی مذمّت

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں / نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دِل پہ ڈیرا / لگا اس جا پہ ہرگز دِل نہ میرا
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا / ولے جاگہ جو بد ہو تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا / کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں / کسی کا جھوپڑا تحت الثریٰ میں
نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا / زمانے پر عبث رکھنا بہانا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی / گہے پستی ہے اور گاہے بلندی
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم / سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم
ہر اِک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے / ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر ہے

### فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیت شہر / مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
کہ کیجے سیرِ فیض آباد جا کر / چلا میں یاں سے اپنا دِل اُٹھا کر
جونہی داخل ہوا میں اُس نگر میں / کھلا جنت کا دروازہ نظر میں

عجب معمورۂ آباد پایا — مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں -

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی — قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی
بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا — مجھے جنت سے جوں آدم نکالا
دُعا میری یہی ہے اب شب و روز — کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز
وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار — وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھروں میں چہچہے کرتا جہاں میں — غزل خوانی کروں جا اِس مکاں میں
رہیں میری غزلخوانی میں شامل — رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل

## رُباعی کا نمونہ

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے — معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں — یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

ولہ

کیا وحش و طیور و انس و جاں عالم میں — جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اِس غم میں
روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں — جلتے ہیں یہ دلِ حسینؑ کے ماتم میں

## ہجو کا نمونہ

اپنے گھر کی حالت

ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر — دو ور[۲] وپیہ کے تئیں کرائے پر

جان سے ہیں تنگ اُس میں لوگ
گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ

پہلے اُس گھر کی خوبی یہ پائی
آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی

کلّہ آماس کر گیا سارا
پہلے ہی مجھ پہ گھر نے مُنھ مارا

وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال
پہلے مُنھ چومتے ہی کاٹا گال

صنعتِ اعداد

صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار
ایک دو تین چار پائی وار

پانچ بلّی کا کُہنہ سا چھپّر
ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر

نو کا یا دس کڑی کا اِک دالان
تس پر اِک ٹوٹے جھونپڑے کی شان

سیڑھی اِک بانس کی پُرانی سی
آنے جانے کے واسطے ہے دھری

نہ تو مطبخ نہ واں مکانِ ضرور
دونوں باتوں کا واں نہیں دستور

ایک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ
صحن میں ساری جا ضرور کی کیچ

اُس پہ دو ٹٹیاں برائے اوٹ
وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ

ڈیوڑھی کا بند کیجئے جب در
بیٹھیے جا ضرور تب جا کر

آنے والا جو کوئی آ جاوے
دیکھ دروازہ بند پا جاوے

یعنی در جو کھُلا نہیں پایا
کوئی ہے جا ضرور کو آیا

گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی
گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی

ٹوٹا پھوٹا جلا بھُنا سارا
دھوپ سے گرم جیسے انگارا

حیزِ آبی و بادی اُس میں کم
زور خاکی و ناری کا پیہم

یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ
کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ

خوب یاں کا کھُلا جو ہم پر بھید
چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید

دِن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی — رات پلکوں سے قطرہ افشانی
گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب — ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب
کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار — دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
تکیے رہتے ہیں اس طرح مَیلے — جوں تیمم کی خاک کے تھیلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان — ہوگئے کل وہ کوہ ریگستان
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات — جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم — ریگ ماہی ہوے تمام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب — حرف مٹ مٹ کے ہوگئے ہیں خراب
صاف آٹا نہ کوئی سانے گا — خوب جب تک نہ خاک چھانے گا
کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں — خاک کھاتے ہیں کیچ پیتے ہیں

قصیدہ کا رنگ یہ ہے -

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم — جسکی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم
خوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جسکے — نقش پا سے گل نرگس کو کرے وا تسنیم
عرقِ شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب — عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کسکے دو نیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور — غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
شاید اس باغ میں ہے آصفِ دوراں کا گذر — کہ ہے وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیرِ اعظم — نائب ظل الٰہ صاحب تاج و دیہیم

میر تقی میر | میر محمد تقی نام میر تخلّص۔ ریختہ گویان ہند کے اُستاد اعظم شاعران اُردو کے رہبر مسلم۔ ادب و زباں دانی کے ماہر فن۔ خوش گو خوش بیان شیریں سخن۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے مگر ذکر میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا۔ البتہ یہ تحریر کیا ہے "کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترک دُنیا کر کے بیٹھ رہے شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے علم ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا جوان صالح و عاشق پیشہ تھے اس لیے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے" چونکہ اُن کا نام تحریر نہیں ہے لہذا ممکن ہے کہ نام میر عبداللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں "میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنی قوم و قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہونچے وہاں سے وہ احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے بعض تو اُن میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میرے جد کلاں نے اکبرآباد میں توطن اختیار کیا مگر ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھے وہ اکبرآباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز کے بعد اس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے" میر صاحب نے اِن کے چند قصّے بیان فرمائے ہیں۔ درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر جس نے مکر و فریب کا

جال پھیلا رکھا تھا اُس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ دلی آئے وہاں اُنکی بڑی
قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پر اُن کی نظر پڑی جو خلوص
کے ساتھ اُن کا معتقد ہو گیا وہاں سے آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ وہ
نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہونچا اور وہیں رہ پڑا۔ اُن کا نام سید امان اللہ
تھا اور میر تقی اُن کی عزت کرتے تھے میر صاحب کی تربیت میں اُن کو بڑا دخل تھا
میر صاحب اُن کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار کہکر یاد کرتے ہیں
دن رات اُنھیں کے پاس رہتے اور اُن کی تمام تربیت سید صاحب کے زیر نظر
ہوئی۔ سید امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔
میر صاحب اور اُن کے والد کو اُن کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُن کے
والد بھی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے
بڑی بے مروتی کی اور باپ کے کُل ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ اِس صغر سنی میں میر صاحب
اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف
ہوئے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیرباد کہکر شاہجہاں آباد
دہلی پہونچے۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامرا کے بھتیجے تھے اُن کو
نواب کے پاس لیگئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادرشاہ
کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ میر صاحب
کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آگئے مگر جب گذراوقات
کی کوئی معقول صورت نظر نہ آئی تو پھر دلی کا رُخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے
خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں جاکر ٹھہرے اور کچھ دِنوں اُن سے

پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہونچانے
کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو اسقدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے
بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی حکیم فخرالدین خاں
نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہ ایک بزرگ میر جعفر نامے سے
کچھ تعلیم حاصل کی اور سید سعادت علی خاں نے اُن کو ریختہ میں شعر موزوں کرنیکی
ترغیب دی اُدھر خان آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز مجبوراً میر صاحب اُن کے
مکان سے نکل گئے مگر خوبی قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامے نے اُن کو
اپنا مصاحب بنا لیا اور اس طرح تنگدستی سے گونہ نجات ملی۔ جب احمد شاہ دُرّانی
کو سرہند میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے
اور جو خدمت اُن کے لائق ہوئی اُس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ
میر صاحب نے قصبۂ سانبھر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں
اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔
ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اُس نے اُن کی دوستی کا
حق خوب نباہا اور محمد رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا
چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے اور رُہیلوں کی
جنگ میں اُس اطراف کی سیر کی۔ جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے
قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد مہا نرائن دیوان
کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے
خالو کی ہمسائیگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی

لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ
ناگرمل سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے ان کی کچھ تنخواہ مقرر کردی
میر صاحب اُن کے خانہ باغ میں دو پہر رات تک موجود رہتے مشاہرہ معقول
ہونے سے کسی قدر فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دلی کی حالت
ابتر ہو رہی تھی اسی میں میر صاحب کا مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال و اسباب
لُٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب معہ لواحقین کے دہلی سے نکل کھڑے
ہوئے اور کچھ دنوں برسانہ ضلع متھرا میں قیام کرکے کُمھیر پہونچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا
اور بہادر سنگھ یہاں اُن سے بڑی مدارات سے پیش آئے اور سورج مل کے طویلے
میں جو خانہ خرابان دلی کا مامن بنگیا تھا اعظم خاں سے ملاقات ہوئی میر صاحب
کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ سورج مل کے چھوٹے بیٹے
نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کردیا اور خود سورج مل نے روزینہ
مقرر کردیا۔ چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر گھروں کو خراب اور
شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب اکبر آباد
پہونچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ اُن کے شعر و سخن کا شہرہ
اب عالمگیر ہوچکا تھا چار مہینے وطن میں رہکر سورج مل کے قلعہ میں آگئے۔ کچھ
دنوں بعد پھر اکبر آباد آئے اور پندرہ روز رہکر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار
سے راجہ ناگرمل معہ اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ
کا سرحدی مقام تھا۔ میر صاحب بھی اُن کی معیت میں تھے اور بوجہ ملازمت اِسی
شہر میں چند دِن اقامت گزیں ہوئے مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملازمت سے

کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ نے میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے اُن کی طرف سے سب عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا ناچار میر صاحب بھی اُسکے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہونچے اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جُدا ہو گئے۔ سرداروں کے اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر خورد حسام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب اِن دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی اُن کو اکثر طلب فرماتے۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابوالقاسم خاں اور عبدالاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگی لکھنؤ۔ لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں "فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہے چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے

خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور اُنھوں نے سرکار سے زادِ راہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجائیے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ چونکہ خُدا کی یہی مرضی تھی میں بے یار و مددگار بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے اُنھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں۔ مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہونچ گیا۔ اول سالار جنگ کے یہاں گیا اُنھوں نے میری بڑی عزّت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگانِ عالی کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا ملازمت حاصل کی۔ محض فراست سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لیگئے اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سُنائے۔ سبحان اللہ کلام الملوک ملک الکلام۔ اس کے بعد فرطِ مہربانی سے مجھ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں۔ بندگانِ عالی مختار ہیں اُنھیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دونگا دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا۔

سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے"۔

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لئے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہمرکاب تھے اُسکی یادگار میں شکارنامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ اُنھوں نے دوسرا شکارنامہ کہکر حضور میں پیش کیا۔ اس شکارنامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور مخمس تضمین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کردی ہے بڑھاپا آپہونچا اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہوگئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی ضعف بصر کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اُکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ۔ بے دماغی۔ ناتوانی؛ دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہونگا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو" [۱]

**میر صاحب کی عمر** میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے ناسخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ع "واویلا مُرد شہ شاعراں" سے وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرۂ جہاں میں میر صاحب کی عمر

[۱] ملخص از ذکر میر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب (رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)

۸۰ سال تحریر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۹ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسّی سے متجاوز ہو چکا تھا مگر یہ قیاس پر زیادہ تر مبنی ہے۔ کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۱۹۷ھ ہوتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۱۳۷ھ ہجری ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا تھا اُسوقت اُن کی عمر صرف ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ اگر پیدائش کا سن ۱۱۳۷ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکر میر ۱۱۹۷ ہجری

میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "جب میں ۱۸۴۸ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہان اودھ کے کتبخانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانحعمری موسوم بہ ذکر میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۱۵۲ صفحات کی ہے۔" یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اُردو حیدرآباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اسکی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہو گئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا۔ اکثر ظنّی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کئے قلمبند کر دیں اور اُن کو بعد کے

لوگوں نے مستند تسلیم کرکے اور زیادہ چمکا یا افسوس ہے کہ ذکر میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعرا میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا "مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد دست بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد دست"۔ یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا ذکر میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے۔ نادرشاہ کی جنگ سے لیکر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۱۵۱ہجری سے لیکر ۱۱۹۷ھ تک کی تاریخ ہے اور اُس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مؤرخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابان اودھ کے معرکے۔ انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں۔ اہل ہنود و مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہٰذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہوسکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اُس زمانے کے لٹریری پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

**[و]لادت میں اختلاف** تذکرۂ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جبکہ میر صاحب حیات تھے اور دلّی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت

سید نہ تھے بلکہ میر تخلص ہونے کی وجہ سے سید خیال کیے جانے لگے۔ تذکرۂ آبحیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ جب اُنھوں نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ نخواہ سید ہو جاؤ گے اُسوقت اُنھوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سودا کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جسکا آخری شعر یہ ہے

میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد

بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھمیر

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت میں [ا] شبہ نکرنا چاہیے اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے

[ا] ۔ مصنف آبحیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے اُن کے سید ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کردی ہے۔ افسوس ہے اُنھوں نے ایک غیر معتبر روایت "کہن سال بزرگونکی" زبانی نقل کردی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جسکے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اُڑایا گیا ہے مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت وغیرہ کا محضر تیار کر کے ادائے شہادت کرتے ہیں کہ اُن کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اُس شبہ کی آپ ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اُن کو "خلف میر عبداللہ" لکھتے ہیں یعنی اُن کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے بیٹے کا نام "میر عسکری عرف میر کلو" بتلاتے ہیں ۱۲

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اِس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذِکر میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے۔ میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔ اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا ہے اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے کہ جب اُنھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اُس وقت شعر نہیں کہتے تھے۔ "میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لئے ناگواری کا باعث ہو،، آزاد نے اپنی نہایت قابل قدر، مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آبحیات) میں بعض غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں جن سے اُن کی بد دماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفر دلّی کا ذکر کیا ہے۔ اور میر قمر الدین منت اور سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ اِن واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصے اور سُنے سُنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیئے۔ الحمد للہ کہ نکات الشعرا کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے

اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے۔ نکات الشعرا کے متعلق آبحیات میں ہے "کہ نکات الشعرا شائق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔ | نکات الشعرا |
اُس میں شعراے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھونگا۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی شعرا کا آدم ہے اُسکے حق میں فرماتے ہیں۔ وے شاعریست از شیطان مشہور تر" مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعرا اب شائع ہوگئی ہے اُس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اُس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر ہے بلکہ فی الحقیقت تقریبًا سو شعرا کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک وصاف ہے تنقید بھی نہایت مختصر اور زوردار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھدیتے ہیں کہ فقیر کو اسکے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم۔ اور صرف اُسی صورت میں جبکہ کوئی شخص اُسکا مستحق فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا۔ بلکہ برعکس اُس کے اُنکی نسبت تو یہ لکھتے ہیں "کہ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آبحیات میں ہے

کہ "میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے" یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بد دماغی کا تذکرہ نکات الشعراء میں کہیں پتا نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا اُستاد و پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناروا داری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے میر صاحب نے اُس کے متعلق ذکر میر میں تحریر کیا ہے۔ لیکن اُن کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ اُنھوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بد وضعی کی۔ ذکر میر میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اُنکی تربیت میں سعی نہ کی جائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہونچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ اُن کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے" اس رنج و غم میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ ایک وہ زمان آرزو نے میر صاحب کو

کھانا کھانے کے لئے بلایا اور ناگوار و تلخ باتیں کرنا شروع کیں میر صاحب بغیر کھانا کھائے اُٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی ہمسائگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بابتہ لکھتے ہیں کہ میرے خالو بادیہ پیمائے طمع ہوے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے اور میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوے۔ اُنھوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد دعوی ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہوگا کہ اُن کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب کیے جائینگے تو اُنھوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب اُن لوگوں کا ذکر جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اسوجہ سے کہ میر صاحب نے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے۔ مثلاً میاں شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں۔

مستوطن چھاچھو کہ قصبہ ایست متصل اکبرآباد حریف ظریف، ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ''

میر صاحب کا کیرکٹر

اس میں کوئی شک نہیں کہ قسام ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ کی تمکنت، خودداری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر رؤسا اور امرا کے ارتباط اور میل جول تک کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اس سے اُن کی خودداری پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ بیحد ضابط، کم گو، اور آزاد طبیعت واقع ہوے تھے۔ افلاس اور کم مائگی نے اُن کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا تھا۔

نازک دماغی

میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ راجہ ناگرمل جو اُن کا بڑا قدرداں تھا اسکی رفاقت محض اسوجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے بادشاہی اُمرا سے کر کے آئے تھے اُسپر اُس نے عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے میر صاحب کو گھر سے اُٹھا لے گئے اپنے کلام کی اصلاح کی خواہش کی میر صاحب نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا اور راجہ ناگرمل سے ملاقات کرا دی اور میر صاحب کی اُنھوں نے بہت کچھ رعایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک روز اُنھوں نے میر صاحب سے فرمائش کی کہ گویئے کو ریختے کے اپنے دو تین شعر یاد کرا دیجیے گا تو وہ گانے کے

قاعدے سے درست کر کے گا لیگا۔ میر صاحب نے عذر کیا خاں صاحب نے اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور اُن کی ملازمت چھوڑ دی عالمگیر ثانی بادشاہ نے بار بار بُلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا اور دوسرے یہ کہ اُنھیں اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ در پیے ہو تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آہی جاتی ہے۔ اُن کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی سریع الغیظ اور جلد برہم ہو جانے والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اسکا ذکر کیا ہے

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ

دِل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ؎

ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ

از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ولہ

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور

پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ؎

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ولہ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

ولہ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشہ میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر و منکسرانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے مگر یہ سب بھی اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ اُن کی مشہور مثنوی اجگرنامہ جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہا قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ اُن کے فطری غرور اور بد دماغی کی ایک بیّن مثال سمجھی جا سکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو اِن الفاظ میں یاد کرتے ہیں "مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع ..... دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کمن بسبب شاعری است یا وضع او ہمیں است خوب ست مارا باینہا چہ کار ..... بامن ہم آشنائے بیگانہ است"، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر شخص کو اسی ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مرزا رفیع سودا کی نسبت اس طرح رطب اللساں ہیں "غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست..."

چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اور اشاید" اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اس قدرتی کمزوری پر اور گل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں "اگر یہ غرور و بدوماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبّہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سرہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔" اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعرا" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ اُنھوں نے میر صاحب کے غرور اور بدمزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لیلیں۔

میر کے کلام میں مایوسی و درد

میر ازل ہی سے دردمند دل لیکر آئے تھے اور اُن کو دُنیا میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں ؎

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ ۔۔۔ قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

پھر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین کہ "اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف ست۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگی وبال ست۔ دِل باختۂ عشق بودن کمال ست عشق بسازد۔

عشق بسوزد۔ درعالم ہر چہ ہست ظہور عشق است ..... بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست"۔ چنانچہ جابجا میر صاحب فرماتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو ۔۔۔ سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

؎

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے ۔۔۔ اِک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں

میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ زمانۂ طفولیت ہی سے شان درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہو گئی تھی۔ سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہل دِل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُن کی سوز و گداز بھری باتیں سننے کا موقع مِلا جو اُن کے دل میں اُتر گئیں اور جن کا رَس اُن کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا"۔ میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور ہے۔ بچپن سے ہی مصیبت کا سامنا تھا۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا۔ تلاش معاش کے لیے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بیرخی اختیار کی۔ دلی گئے وہاں بہت تکلیف سے کٹی۔ خان آرزو بھی درپے آزار ہو گئے۔ میر صاحب بہت ہی دل شکستہ و دِل گرفتہ رہتے تھے۔ اِس پر بے نوائی و بے بسی۔ اس غم و غصہ میں ایک جنون کی سی حالت ہو گئی اور اُنھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے اُن کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکر میر میں موجود ہے اور اُن کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں

درج ہیں۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل — پراگندہ روزی پراگندہ دل
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دِلّی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا — مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہوگیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا — کبھو سنگ در دست رہنے لگا
نظر آئی اِک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں

دِلی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو کل نان شبینہ کے محتاج۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہونچی۔ اِس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی۔ چنانچہ کلام میں بھی اِس حالت کی جھلک موجود ہے ؎

نامرادانہ زیست کرتا تھا — میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو
بہت سعی کیجئے تو مَر رہیے میرؔ — ولہ — بس اپنا تو اِتنا ہی مقدور ہے
نہ مِل میرؔ اب کے امیروں سے تو — ولہ — ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

پھر دِلی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دِن کے انقلاب۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ دُرّانیوں کی دستبرد و غارتگری اپنی آنکھ سے دیکھیں اور قلم سے لکھیں ؎

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
دِل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا — ولہ — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مولوی عبدالسلام ندوی نے بہارِ بیخزاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب تیغ عشق کے زخم خوردہ تھے اور اُن کے دِل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر اُن کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اِسکی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کردیا ہے۔ چنانچہ بہارِ بیخزاں میں ہے کہ " بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میلِ خاطر داشت آخر عشقِ او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بجا رسوے رسوائی مے کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری درآید از ننگ افشاے راز وطنِ اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشا دوست و گریبان قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ براندازیہا بشہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد تا بقید رشتۂ حیات بود طوقِ محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت از کلامِ عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است کہ صد آرزو بخاک بردہ"۔ میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی درپردہ اسکی تصدیق ہوتی ہے ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں ؛ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا ؛ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی۔ اشعار سے اِس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

**تصانیف** میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی

عمر پائی تھی۔ لہذا تصنیف و تالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)

(۳) متعدد مثنویاں

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں۔ اُن میں بعض بہت فحش ہیں اُس سے اُس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعرائے اُردو کا موسوم بہ نکات الشعرا۔

دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں۔ مستزاد۔ واسوخت۔ مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مطلع۔ تضمینیں۔ فردیات۔ غرض کہ جملہ اقسام سخن موجود ہیں۔ دیوانوں کے صدہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے۔ مگر اول تو اُنکی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلۂ سودا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی۔ اس وجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور بھٹئی سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ استغراق خودداری اور قدرتی کم سخنی اُن کو بیجا لفاظی کیطرف کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔

مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہرآشوب کی صورت میں ہیں جنہیں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں۔

غزلوں کے بعد اُن کی مثنویوں کا نمبر ہے جنکی تعداد بھی کثرت سے ہے مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اجگر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعرا کی حقارت کا ایک منظر ہے۔ اس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہا تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں سانپ بچھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اُس زمانہ کے کم مایہ شعرا مُراد ہیں۔

(۲) شعلۂ عشق (۳) جوش عشق (۴) دریائے عشق
(۵) اعجاز عشق (۶) خواب خیال (۷) معاملات عشق
(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فن نظم اور اُس کے مرتبہ کا بیان ہے

ان کے علاوہ تین مثنویاں شکار نامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت اُنس تھا۔ مثلاً کتا۔ بلی۔ بکری وغیرہ۔

ایک مثنوی مرغبازاں۔ ایک میں موسم برسات اور اُس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفر برسات کا ذکر ہے ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کی طرف سے

خطاب کر کے لکھی ہے کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں
تاریخ گوئی کا اُن کو مطلق شوق نہ تھا ۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے ۔

میر صاحب کی ایجادیں

میر صاحب اُردو واسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں
اسی طرح اُردو میں مثلث و مربع یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں بھی انھیں کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کر کے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی مربع۔ مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے ۔

امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی ۔۔۔ بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گماں

اس پر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا ۔

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی ۔۔۔ امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی
بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گماں

میر صاحب کی شہرت خاصکر اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ غزلوں میں تو فی الحقیقت اُن کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نہیں پہونچتیں پھر بھی اُن کی بیساختگی اور فصیح البیانی و سادگی قابل داد ہے۔ دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف کر دیا تھا ۔

تذکرۂ نکات الشعرا

یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ عیسوی میں لکھا گیا یہ حسب دعوے مصنف شعرائے اُردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعرا کے متعلق اسمیں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں

جن شعراء کا ذکر ہے اُن کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے -

| |
|---|
| میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ |

میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا اُن کے ترجمہ کو اُردو میں داخل کرکے اُس کو ریختہ بنایا - آزاد نے آبحیات میں اُسکی بہت سی مثالیں دی ہیں مثلاً

| | | |
|---|---|---|
| ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا | | پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا |
| دِل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش | | ایک عالم کے سر بلا لایا |
| اے توکہ یاں سے عاقبت کار جائیگا | | یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائیگا |

ترجمہ کی مثال -

| | |
|---|---|
| گل کو محبوب ہم قیاس کیا | فرق نکلا بہت جو باس کیا |

باس کرنا یا بو کرنا فارسی 'بو کردن' کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا -

اِن میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھیریں جو رفتہ رفتہ متروک ہوگئیں - میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعرا کے آخر میں دیئے ہوے ہیں، خود اُنہی کی زبان سے سُننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں :-

بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم ست - از انجملہ انچہ معلوم فقیرست نوشتہ می آید اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعۂ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ شد - دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی - چنانچہ شعر

| | | |
|---|---|---|
| ۵ | زر گر پسرے چو ماہ پارہ | کچھ گھڑئے سنوارے پیکارا |
| | نقد دل من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا |

مرزا معز کہ نوشتہ آمد۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند، و ایں قبیح است
چہارم آنکہ ترکیبات فارسی مے آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد
آن جائز ست۔ و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نا مانوس ریختہ می باشد
آن معیوب ست و دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم
ہمین ست اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام آست
کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم
است مگر بسیار شستگی بستہ بشود۔ معنی ایہام این ست کہ لفظے کہ برا و بنائے بیت بود
آں دو معنی داشتہ باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب
متروک او۔ ششم انداز ست کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است
تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال
وغیرہ۔ ایں ہمہ در ضمن ہمین ست و فقیر ہم ازہمیں وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں
فن طرز خاصی است ایں معنی را می فہمد۔ باعوام کار ندارم"

**میر بحیثیت شاعر کے** عام طور پر اُردو شاعری اُردو تغزل کی مرادف ہے اور
میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے
کہ میر صاحب زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔
میر صاحب کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ
غزل گوئی میں اُن کا جواب نہیں اور اُس مملکت میں وہ منفرد اور تن تنہا حکمراں
ہیں۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر

لہ۔ از زلف سیاہ تو بدل۔ دد م پری پیسے : درخانۂ آئینہ۔۔۔ گتا جوم پری ہے ؛ ۱۲

سے مملو ہوتے ہیں۔ اُن میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار جذبات چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ اِن کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کیجا سکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ میر صاحب کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو اُن کے صدہا ایسے شعر نکلیں گے جنمیں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر سُنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ اُنھیں بہتّر نشتروں میں سے ہے۔ زبان شستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اُردو کے شیخ سعدی ہیں ان کا کلام اکسیر شاعری ہے۔ علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی اُن کی شاعری کی جان ہے یہی ناامیدی اور یاس اُن کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے میر صاحب شاعری اور زباندانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ اُن کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو اُن کے بعد ہوئے اُن کی عظمت اور اُستادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ اُن کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کی بیحد تعریف کی ہے۔ اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ شاعر اور نشّار دونوں اُنکی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ

اور نیچر دونوں میں اُن کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سرآمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے افصح الفصحا اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے۔ اِسی طرح مرزا علی لطف تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ "جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال میں اور ریختہ گویاں سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے"۔ صاحب طبقات الشعرا لکھتے ہیں "مجموعۂ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران عصر محاورہ داں و متین متلاشی مضامین نو و رنگین متجسس الفاظ چرب و شیریں۔ در میدان غزل پردازی گوے فصاحت از معاصراں مے برد و ہر چند سادہ گو ہست اما در سادہ گوئی پرکار رہیا دارد"

حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمۂ فیض تھے۔ اُن کے کلام کی حلاوت و دل آویزی اُن کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آجتک مشہور ہیں بلکہ جب تک زبان اُردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

**میر اور سودا کا مقابلہ**

میر صاحب کی شہرت اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا۔ چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا

درغزل گوئی بودے (میر تقی) نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوے دیگرست، مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر میرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری" اسی طرح ایک مشہور صاحبدل خواجہ باسط نے، جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا "کہ دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے"۔ اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں بزرگواروں کے طرز کلام کا فرق اُن کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب قدرتاً حزیں اور غمگیں واقع ہوے تھے ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ خودداری اور عزّت کا اُن کو بیحد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ عُزلت اور تلخکامی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر بھر تلخابۂ حیات پیتے رہے بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے۔ خوشی اور ہشاشی بشاشی کا حصّہ قسّام ازل نے اُن کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اس کے سودا نہایت شگفتہ مزاج اور رنگیں طبع واقع ہوے تھے وارستگی اور آزادی اُنکی طبیعت کا اصلی جوہر تھا۔ خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے

خوشی کے مجمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے، جہاں
اُن کی قابلیت خداداد کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت فارغ البالی اور شادکامی
سے بسر کرتے تھے۔ نظر بریں ان دونوں کی شاعری اُن کے خیالات اور
اُن کے مزاج اور دُنیا کے ساتھ اُن کے برتاو کا بہترین آئینہ کہی جاسکتی ہے
اِسی طرح اُن دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کئے ہوے
الفاظ بھی اُن کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ درد واثر کے
لیے الفاظ نہایت نرم اور صاف وسادہ اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلف
ہونی چاہیئے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ علی الخصوص
چھوٹی چھوٹی بحروں کے لئے جسمیں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروج
کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لئے شاندار الفاظ،
علو مضامین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کہنا
ایک پژمردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب
ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک حالات جن بے تکلف اور سیدھے سادے الفاظ
سے ظاہر ہوسکتے ہیں وہ قصیدہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔
میر درد واثر اور سادگی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ ان کے وہ اشعار جو
بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود اُنھیں کے سچے اور دلی جذبات
کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تخیل سے اُسمیں رنگ آمیزی
مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی ایک درد والم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی

یہ سطور اُن کے حسب حال ہیں "وہ حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر شعر وہی ہیں جنمیں درد و الم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سا درد نہیں۔ میر کے اشعار غمگین اور چوٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ اُن کا قصہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رُخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے نہایت آب و تاب اور سچّائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا اُس کا دوسرا رُخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے مملو ہے۔ سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لئے سامان طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولانگاہ اپنے اظہار خیال کے لئے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور اُن کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزا دیتے ہیں جو انواع و اقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے انقباضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے۔ میر کی دُنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جسمیں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ اُن کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت میں ہیں "وہ جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے اُمید کو پیچھے چھوڑ آئے" میر کی ہنسی اور مذاق بناوٹی اور انکی

طعن وتشنیع مصنوعی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں اُنھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت اِن اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناکام رہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت واقتدار کی بے پروائی کیوجہ سے ان اصناف سخن میں سرسبز نہوسے۔ اُنھوں نے اجگرنامہ ضرور لکھا مگر وہ سودا کی ہجووں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اسی طرح اُن کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں سودا کے قصائد کے سامنے ہیچ ہیں۔

دونوں بزرگوار میر اور سودا حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں۔ دونو وہ کامل مصوّر ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوبصورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ اُن کے لفظی مرقعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی، یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت، دونوں کی ہوسکتی ہے۔ پس جہانتک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد وغم کے جذبات کا تعلق ہے اُن کے اعلام واظہار میں میر صاحب متفرد ہیں۔ مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اُن کے مالۂ اور ماعلیہ کا اُن کو بدرجۂ کمال علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق خودی کیوجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس وسیع النظری سے نہیں کرسکتے اُن کی محدود نظر اسی استغراق اور خودبینی کا نیتجہ ہے۔ وہ اپنے رنگ میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کو اپنے کام میں اسقدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے خاص کام میں یکتائے زمانہ ہوگئے۔ وہ تنوع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں۔ بخلاف میر صاحب کے جنکی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار۔ جسکے پھول پژمردہ و افسردہ جسکی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی جائے پناہ۔ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالۂ وزاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالم خواب کی سیر کی جائے۔ مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشاں ہوتے ہیں۔ برخلاف اِس کے سودا کی دُنیا جیتی جاگتی دُنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر۔ جس کے باغ سرسبز و شاداب۔ جس میں بادِ صبا خوبصورت پھولوں اور نازک پتّیوں کے ساتھ ہر وقت اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی شاعری کی تو وہ جان ہیں۔ اگر اُستادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حُسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سودا وہ اُستاد ہے جو اُن کے صحیح استعمال پر قادر ہے۔ اُنکی یہاں دلچسپ تشبیہیں اور نادر استعارے میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ وہ اُن مختلف علوم و فنون سے بھی

جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میر کے زیادہ واقف ہے۔
یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت اُس کو ایسے مضامین اور الفاظ سُجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سودا کے اس قسم کے اشعار اُن قواعد کے ضرور خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قِسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو اُن کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعرائے فارسی کی تتبع میں ہے جن کے قدم بہ قدم اُردو شعرا چلنا چاہتے ہیں نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اُس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ، مذہب، اخلاق تصوف اور دیگر علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لئے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتّب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ اُردو شاعری جو فارسی کی متبع تھی اس انقلاب سے اُس نے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔
البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخر الذکر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دِل کے دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جسقدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اُتنی ہی درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین

و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نوآموز شعرا کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور میر دونوں موسیقیت الفاظ کے اُستاد ہیں اُن کے شعر سانچے میں ڈھلے ہوے۔ بندش نہایت چست۔ اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی۔ وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں اُستاد دور از کار تلمیحات اور تشبیہات سے بچتے ہیں۔ اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اِس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔ دونوں اُستادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کارآمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لئے بہت دلچسپ ہے کہ اُس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اُس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی مبتذل اور فحش الفاظ استعمال ہوے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیر و تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں۔ اَمرد پرستی جو اُس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام میں

جابجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد واثر، فصاحت و بلاغت، اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔ کسی کا قول ہے اور سچ کہا ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں۔ سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زمرد، اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں سچی کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے۔" [۱]

**اس عہد کے دیگر شعرا** اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور اُن کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہٰذا یہاں اُن کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر اُن کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں [۲]۔

---

[۱] میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لئے دیکھو بقا کے اشعار صفحہ ۲۵۴

[۲] اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصراً باب ۷ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے دیکھو صفحہ ۲۴۵۔

# باب ۷

## اساتذۂ دہلی

## طبقۂ متاخرین

## انشأ اور مصحفی کا زمانہ

طبقات کی ترتیب اِس دور کی ترقیاں

شعرا کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہو۔ گو یہ سچ ہو کہ اکثر شعرا ایک دور کے ماقبل کے دور کے بعض شعرا کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دورِ ماقبل میں نوجوان اور نوآموز تھے اور اُس وقت اُنھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دورِ ماقبل کے شاعر کہن سال، مشاق، اور مشہور ہو چکے تھے، اسکے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اِس دَور میں بمقابلہ دورِ ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہوگئیں اور اُن کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ اس معاملہ میں زبان اُردو انشا کی بہت احسانمند ہے جنھوں نے اسکی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کیے۔ مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔

شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی

اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کردیا۔ دورِ ماقبل کے شعرا گو اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعرا کی قدردانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر اُن کی خودداری اور عزت و آبرو کم ہوگئی۔ شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اُس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں۔ شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم و ابرو ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ اُن کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہذا اشعار بھی اُنھیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہوگئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں پہونچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بدمزگی شعرا میں پیدا ہوگئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بدمزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہوگئی تھی لہذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے۔ اور اُن کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوج اور لتا ڑگی کے درجہ تک پہونچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج

شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی متانت اور پاکیزگی اور علوِ خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اُسکی آیندہ ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہوگئی۔ شعر کی روحانیت اور بلند پروازی مفقود ہوگئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی مراد ہوتا تھا اب بجاے اسکے کوئی لونڈا یا رنڈی، جنکی ایسے عیش پرست درباروں میں کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہواتی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش امرا اور اُن کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام واکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں، گوکہ وظائف اور تنخواہیں وہ بھی پاتے تھے، متانت اور سنجیدگی اور آزادیِ مزاج ابتک باقی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی۔ شعر گوئی ایک مقدس اور معزز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اُسکی نشو و نما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجاناں، یہ سب مشہور اہلِ دِل بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اسکے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اُٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہوگئی۔ اب شاعر ولی ہونے کی نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑکر لکھنؤ آگئے تھے کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اس زمانہ کے بگڑے ہوے مذاق نے اُن کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی

ایک جدید صنف شاعری، یعنی ریختی، جسکو اس انحطاط مذاق کا بدترین نمونہ سمجھنا چاہیئے اسی دور میں وجود میں آئی - اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ جنھوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعیش میں اعلی تعلیم حاصل کر کے تمام مدارج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا - اُن کا کلام عورتوں کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اُس میں اور کچھ نہ تھا - انشا نے بھی بہت کچھ اُس میں حصّہ لیا -

اِس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزاولت سے شعرا نے من حیث الفن بڑی ترقی کی - اگرچہ شیریں کلامی اور رلبند خیالی شعر میں کم ہوگئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا - اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر دو ایک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو اُن کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا اُن میں نام نہیں - اِس عہد کے شعرا نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آیندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی -

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرا نے شاعری کو حصول زر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے - میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کے اُستاد تھے انشا نے اُن کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا

باعث ہوا جس کا تذکروں میں باتفصیل ذکر ہے۔ اُسکی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ بھکڑ مچا کہ خدا کی پناہ! اُن کے مُربّی اس تھکا فضیحتی کا دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور اُن کے مہملیات کی داد دیکر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے۔ بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھکر لاٹھی پونگے اُٹھا لیئے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست وگریباں بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزّت و آبرو کے درپے ہوگئے۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کی لغو اور بیہودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آگیا اور مصحفی اور انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اُس زمانہ کے پُرشور نداق اور بھکڑ کا ایک نمونہ رہگئی ہیں جن کو پڑھکر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

**ہزل گویان اُردو**

اس موقع پر چند ہزل گویان اُردو کا بھی کچھ ذکر کردینا ضروری ہے حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ میر اٹل نارنولی۔ میر جعفر زٹل۔ زانی۔ چرکین۔ فہق میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زانی۔ یہ منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے ہمعصر تھے اور شفیق نے فہق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے۔

**انشا متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ عیسوی**

سید انشاء اللہ خاں متخلّص بہ انشا خلف حکیم میر ماشاء اللہ خاں ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر تخلّص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے جو نوابان بنگالہ کا دار الحکومت تھا اور یہیں سید انشا کی

ولادت ہوئی۔ ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کیئے شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے۔ انشا، مرشدآباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دلّی آئے۔ شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدردان تھے اُنھوں نے انشا کی بڑی قدر کی۔ دربار اُسوقت بالکل لُٹا پٹا تھا۔ مگر پھر بھی اُس قدردان بادشاہ نے اس جواں ہمت اور جواں طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ سید انشا، اہل دربار میں داخل ہوئے اور اُنھوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور چٹکلے بادشاہ اور اہل دربار کو سُنانا شروع کیئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی جُدائی بادشاہ کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ آخرکار دلی کی تباہی سے بددل ہوکر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں اُنکی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے اِنشا نے لکھنؤ کا رُخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعرا اور دیگر باکمالوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔

یہاں پہونچکر اُنھوں نے شاہزادہ مرزا سلیماں شکوہ متخلص بہ سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدردان تھے۔ انشاء نے اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے اُن کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد اُن کے قدیمی اُستاد مصحفی کی جگہ لے لی مگر اُن کی منچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقّی کے

نئے راستے ڈھونڈھتی تھی ۔

**انشا کی تقریب نواب سعادت علیخاں کے دربار میں**

تفضل حسین خان علامہ[1] جو اپنی قابلیت اور حسن تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب سعادت علیخاں کے مشیر کار تھے سید انشا اُن کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے خان علامہ اِن کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت ان کے لئے نکالیں ۔ اتفاق سے ایک دِن سید انشا جوش تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو ذو معنیین تھا ۔ اور اُردو میں اُس کے معنی قابل اظہار نہیں کہنے کو تو کہہ گئے ۔ مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان ماڑواڑی میں "بیوقوف" کو کہتے ہیں ۔ اُنھوں نے کچھ سوچ کر کہا "خیر خاں صاحب انداز معلوم ہوگیا جلد کچھ صورت ہوجائیگی" ۔ دوسرے دِن نواب سعادت علی خاں سے اِنکے خاندان کی بزرگی اور اِن کے ذاتی کمالات کا ذکر کرکے کہا کہ آپ کی صحبت میں اِن کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا ۔ وہ سُن کر مشتاق ہوئے ۔ دوسرے دِن خاں صاحب سید انشا کو لے گئے[2] انشا نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ اُن کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی

---

[1] وزیر علیخاں کی مسند نشینی اور بعد کو اُن کے اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی انھیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی ۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاست داں تھے ۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہیں ۔ سر آئزک نیوٹن کے ڈفرنشل کلکیولس کا ترجمہ انھوں نے فارسی میں کیا ہے ۔

[2] ۔ ماخوذ از آبحیات ۱۲

ناگوار تھی۔ اُن کی حاضر جوابیاں، اُن کے پر مذاق لطیفے، اُن کی ظرافتیں نواب کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ اُن کو ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہوگئی۔ انشا اپنے مذاق اور دلگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گذر جاتے تھے اور جو منھ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے، ایسی باتیں اکثر موقعوں پر تو نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے نواب کے مزاج کا پارۂ حرارت ناپنے کے واسطے سید انشا بسا اوقات اچھے بیرامٹر نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مزاج میں بھی اختلاف تھا انشا کی آزاد طبیعت یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ موقع و بے موقع اور جا و بیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟" انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اُٹھے "بلکہ انجب" (انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اِس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیونکر واپس کیا جا سکتا ہے۔ نواب کے دِل کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو انشا کو زک دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور تکلیفیں اُن کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سوائے ہمارے کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی اُن کے واسطے قید بے زنجیر تھی

اس پر طرّہ یہ ہوا کہ جوان لڑکا تعالی اللہ خاں مرگیا جس سے اُن کی کمر ٹوٹ گئی۔ آخر میں ایک جنونی کیفیت بھی پیدا ہوگئی تھی جسکی ایک عبرتناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آبحیات میں بیان کیگئی ہے[1]۔ اسی اثنا میں تنخواہ بھی بند ہوگئی تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہونچ گئی تھی۔ وہ شخص جو کبھی چہکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ کا ہے جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

خبر انتقال میر انشا — دل غمدیدہ تا نشاط شنفت

سال تاریخ او زجان اجل — "عرفی وقت بود انشا" گفت

**اُن کے کلام کی خصوصیات** انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو مدون کی اور جس تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اُس سے اُن کا

---

[1] آزاد نے انشا کے متعلق خصوصاً اُن کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جو پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتیں اور بہت سی روایتیں مستند طور پر غلط قرار پائی ہیں۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے، کہ سید انشا نہ مجنون ہوے اور نہ اُنکی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علیخاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بُلائے حاضر نہوں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشا و مصحفی میں جھگڑا ہوا اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانیکا حکم دیدیا تھا وہ حیدرآباد گئے چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے پھر بُلالیا (تذکرۂ خازن الشعرا

پایۂ اُستادی بلند ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر اُن کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد ہے۔ اُن کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اُردو کے بڑے پایہ کے اُستاد سمجھے جاتے۔ انشاء کی خاص خصوصیات یہ ہیں (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں انکا ہم پلہ شعرائے اُردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ انکی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں (۲) جامعیت اِن کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا نگینہ جسکے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ (۳) علم و فضل معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسا پرلطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے پیش کرتے کہ حریف اُس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ اور ان کی قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے۔ اور ان دونوں زبانوں میں اُن کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے اِن کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری۔ اور ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرضکہ ایک بہت زبردست اور قابل زباندان تھے۔ تضمین بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت

تیز وطرار طبیعت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی نئی چیزوں میں اُن کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں مثلاً واسع الشفتین یا ذولسانین وغیرہ۔ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی زباں دانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے ہیں اور گو کہ بہت ہوشیاری سے نظم کیے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں۔ ظرافت اور مذاق جوان کا خاصہ ہے بعض اوقات اُسکی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور شعر میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اُس کو مہمل اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے ہو گئی ہو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں ریختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشا اور رنگین کو سمجھنا چاہیئے۔ انشا کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ اُن کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشا کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صنف شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق وظرافت۔ انشا نے سودا کی طرح مگر اُن سے کسی قدر

محدود درجہ پر ہندوستان کی تخئیل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے
ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انھیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے
وہ صائب رائے قائم کرنے میں غلطی کرجاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ہمواری نہیں ہے
غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جسکی وجہ شاید اُنکی
مشکل زمینیں اور قوافی ہوں قصیدہ اور غزلگوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی
برتتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے۔ نواب اور اُن کے عیش پرست
درباریوں کے خوش کرنے کے لیئے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں
یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اُس زمانہ کا عیب ہے۔ یہی حال عہد ریسٹوریشن کے
انگریزی شعرا کا تھا جن کا کلام اُس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ انشا نے
شعر کو اپنے نواب کے خوشی کے ماتحت کردیا تھا وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں
ہوے۔ شاعری اُن کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی۔ اُن کا کوئی اعلیٰ
مطمح نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام اُن کو پہونچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر اُن کو معقول
سزا ملی۔ جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملتے
تھے اور اُن کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ ایسے
زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے
حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہرطور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں
ہے۔ اُن کے کلام میں جابجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مرتبہ میں
کسی سے کم نہیں۔ اِن کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت
اعلیٰ درجہ کا ہے۔ سید انشا اور اُنکی شاعری کے متعلق میاں بیتاب کا چبھتا ہوا جملہ

یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ انشاء کے علم وفضل کو اُنکی شاعری نے کھویا اور اُنکی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی درباداری نے ڈبویا۔ اگر کسی کو انشا کے مفصل حالات دلچسپ لطیفوں اور چٹکلوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آبحیات میں اُن کا حال پڑھے۔

تصانیف

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

کلیات جس میں مندرجۂ ذیل چیزیں شامل ہیں :۔

(۱) ایک دیوان اُردو غزلوں کا جس سے زبان پر اُن کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے مگر ہمواری نہیں ہے۔ فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں، چُست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہوگئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اُردو کے بہترین نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہیں۔

(۳) قصائد اُردو و فارسی۔ جو حمد و نعت اور منقبت ائمۂ معصومین اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازک خیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے گئے ہیں کہیں کہیں اُن کو پڑھکر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گو زبان کا زور اور لطف بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخراپن ہے اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ضبط سے کام لیتے تو اُن کا پایۂ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اُسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جسمیں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے۔ کہ کھیر (شیر برنج) میں نمک ڈالکر تصوّف کو تمسخر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جسکی سُرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً "حمد" کے موقع پر لکھتے ہیں کہ "لوحہ در حمد مالک الملک" "نعت" کے واسطے "لوحہ در مدحِ سرورِ کل" "منقبت" کے واسطے "لوحہ مدح سوار دلدل" "بادشاہ کی تعریف کے لئے" "لوحہ در مدحِ حاکم عصر" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اِس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونۂ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہوجاتی ہے۔

## لوحِ سالِ کلامِ مسطور

دُر در سلکِ کلام کردم | گردِ کرم اِلٰہ گردم
کردم سال ورا محرّر | طور الاسرار و سطر گوہر
۱۲ ۱۲

(۷) مثنوی شکارنامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کے شکار دھرہرہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روزنامچہ کے لکھی گئی تھی اسکی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں۔

## قطعہ در تاریخ

فوجِ ظفر موج بایں عزّ و جاہ　　گرد رسانید چو بر اوج ماہ
شوکتش انشا بخطِ زر نوشت　　فقرۂ تاریخ مظفر نوشت

(۸) ہجویں۔گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں۔ مکھیوں۔مچھروں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے بہت دلچسپ ہے۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں۔اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ ہے

(۱۱) ایک مثنوی بزبان مارواڑی جس میں گیان چند ساہوکار کی ہجو ہے ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جسمیں مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

(۱۲) مأتہ عامل عربی بزبان فارسی

(۱۳) متفرق اشعار، معمے، رباعیاں، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، چیستانیں وغیرہ

## (۱۴) دیوان بے نقط

بھاشا ٹھیٹ ہندی میں | اس مضمون کے نام سے ایک کتاب نثر اُردو میں لکھی ہو جسمیں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اُردو ہے مقدار میں تقریباً ۵۰ صفحے ہونگے۔ اس کے اکثر حصے اُن کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا اسکو کئی جلدوں میں شائع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک راجہ تھا جس کا نام سورج بھان تھا اور اُسکی رانی کا نام لچھمی باس تھا۔ اُن کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہ ہی اس قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دِن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا۔ ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا اڈالا رات ہوگئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک باغ میں اُس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا جن میں راجہ جگ پرکاش درانی کام لتا کی خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ مدن بان رانی کیتکی کی سہیلی اور ہمراز تھی۔ اُس کے کہنے سے اِن دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو اُسکی حالت کیتکی کے عشق میں خراب ہوگئی۔ آخرش یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا تو اُس نے

---

لہ۔ ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید انشا نے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کی دلچسپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے آخر الذکر کا دریائے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اُس کا نقش اول ہو۔

شادی کا پیام راجہ جگ پرکاش کو بھیجا جسے اُس نے بڑی حقارت سے رد کردیا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک مالن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور خفیہ بھاگ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ رانی کیتکی کی غیرت نے اسکو قبول نہ کیا۔ جگ پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اُس نے اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاس پربت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی کمک پر بُلایا۔ اُس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان اور سورج بھان اور مہارانی لچھمی باس ہرن و ہرنی بَن گئے اور کئی برس تک یوں ہی رہے۔ چلتے وقت گرو نے راجہ جگ پرکاش اور اُسکی رانی کو ایک شیر کی کھال اور بھبوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا میں فوراً پہونچ جاؤں گا اور بھبوت اس لیے ہے کہ جو کوئی چاہے اُسکا انجن لگائے وہ سب کو دیکھے اور اُسے کوئی نہ دیکھے۔ رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب تھی ایک روز چالاکی سے آنکھ مچولی کھیلنے کے بہانے اُسنے بھبوت مانگا اور اُسکو لگا کر اُنکو نکل گئی۔ اُسکی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتکی کی تلاش میں بھبوت لگا کر نکلی۔ ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مدن بان واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز راجہ جگ پرکاش و رانی کام لتا پر ظاہر ہو گیا جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے کھال کے بال سے مہندر گرو کو بُلایا اور کل حالات بیان کیے

رانی کیتکی اور اُس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مہندر گرو نے تلاش کر کے کنور اودے بھان اور اُسکے ماں اور باپ کو انکی اصلی صورت میں کردیا راجہ اندر نے بھی اس کام میں اُسکی مدد کی تھی اور آخر ش رانی کیتکی کی شادی بڑی شان و شوکت و تزک و احتشام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہوگئی۔

نمونۂ کلام یہ ہے "اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے۔ اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے اپنا ہاتھ منھ پر پھیر کر موچھوں پر تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے" چونکا

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں

اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت

پہلی کتاب قواعد اُردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اُردو کے متعلق لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۲۲ھ مطابق سنہ ۱۸۰۷ء ہے۔ اسکی تصنیف میں مرزا قتیل بھی شریک تھے۔ انشا نے اس کا پہلا حصہ لکھا جسمیں زبان اُردو کی صرف و نحو کا حال ہے اس میں اول اُردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کیے ہیں۔ طرز تحریر میں وہی ظرافت اور تمسخر ہے جو اُن کے دم کے ساتھ ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے۔ اسمیں عروض و قافیہ

منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قتیل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لُطف سے خالی نہیں مثلاً تقطیع میں بجائے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خانم۔ بیجان پری خانم۔ درج ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔

سید انشا، پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اُنھوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور تلفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ اُنھوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اُس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اُردو کی ترقی پر ڈالتی ہیں۔ قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اُردو کے حروف تہجی اور اُنکی آوازوں کو نظر تعمق سے دیکھا ہے ان کی رائے میں مجموعی آواز ونکی تعداد ۸۵ ہے۔ زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوربی، ماڑواڑی وغیرہ کے نمونے دیے ہیں اور دکھایا ہے کہ اِن کا اثر اُردو پر کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اسمیں بہت سے متروکات دیکر اُن کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اس کے وہ قدیم اُردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ انشا من حیث الادیب اور نیز من حیث الشاعر بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشاق تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک قطعہ خمخانۂ جاوید جلد اول سے نقل کر کے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلّص ایک شاعر تھا جس نے اُن کی ہجو کہی اور خود لاکر سُنائی تھی۔ اُنھوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپئے دیے اور یہ قطعہ بھی کہکر روپوں کے ساتھ ساتھ اُس کے حوالہ کیا۔

فائقِ بے حیا چو ہجوم گفت | دلِ من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم | دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

اس شاعر نے لفظ ید کو مشدد باندھا تھا انشا نے اُس کے جواب میں بطور تعریض کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے۔

چہ خوش گفت مایق شاعرؔ غرّا | کہ چوں ذہن او ذہن رسّا نباشد
یکے شعر نادر کہ در چند وزن | شود خواندہ و شک بمعنا نباشد
دراں لفظ ید را بدال مُشدّد | نوشت است و ایں غلط اصلا نباشد
شنید ایں سخن را چو گرّد سخن | ز انشا کہ ہمسرّش اصلا نباشد
بگفتا کہ من شاعرِ خوش فکرم | چو من ہیچ معقل گویا نباشد
تو گلستاں را ندانی درست | ترا ہیچ شعور و ذکا نباشد
سند یاد از اُستاد است مارا | بکلام ما ہیچ خطا نباشد

جو تشدید در شعر ضرورت افتد　　　تشدید صحیح چرا نباشد

جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ) جرأت تخلص مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام یحیٰی امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے اور سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت دربانی پر مامور تھے۔ دلّی میں کوچۂ رائے مان[1] انھیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملۂ دہلی ۱۷۳۹ء میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانۂ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی چنانچہ خود کہتے ہیں

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ ناسخ اور نساخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی تاریخ یہ ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے　　　گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا　　　ہاے ہندستان[2] کا شاعر مُوا (۱۲۲۵)

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے

---

[1] گلی کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اُس پر "کوچۂ رحمٰن" لکھا ہے ۱۲
[2] ہندستان بغیر واو کے پڑھنا چاہیے ۱۲

نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے[1]
افسوس ہے جوانی ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ
حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے
آب حیات میں اسکو بہت طول دیکر لکھا ہے مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج
شاعر جنس نازک کی پُر لطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب
سے شرفا اور اُمرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے
بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا
اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا
اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا۔ آخر کار اپنی اس بدکاری کی پاداش
میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون
سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق اُن کو خلقی تھا، کبھی
فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "دیوانۂ
فن شعر است کہ گاہے بفکر نمی ماند۔ بسیار دردمند و گداز است"

**تصانیف** ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، دیوان میں
غزلیں، فردیات، رباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، واسوخت،

---

[1] مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور
ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے
ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظر احکام ہے" ۱۲

تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے، سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مرثیوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں اُن سے ۱۱۹۱ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ۶۲ صفحات اور دوسری ۳۲ صفحات کی ہے۔ ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا نام "حسن وعشق" اور اُس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اُس کی زبان نہایت فصیح و پرلطف اور کلام نہایت نمکین و بامزہ ہے۔

**جرأت کی خصوصیات اور اُن کا مُقابلہ میر کے ساتھ**

جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری مشکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اُس زمانہ کے ذی استعداد شعرا کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب کے دور چلتے ہوں اور حسن وعشق کے چرچے ہوتے ہوں۔ عاشقانہ رنگ، بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اُس میں اِن کو درجۂ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی سرحد سے مِل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزّال تھے اور دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرأت کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرأت سطحی شاعر ہیں۔ اِن کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز و کرشمے، عُشّاق کی حرماں نصیبی، ہجر کی مصیبتیں، درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت

اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرضکہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سوسائٹی
کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے
انکی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو اُنھوں نے اختیار کیا
اور اُس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی
جس سے ان کا طرز علیحدہ ہو کر مقبول عام ہو گیا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ
میر میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر کا تخیل بلند اور اُن کا عاشقانہ
رنگ بہت اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے، جرأت کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔
میر کے قدردان اہل دل سخن شناس اور جرأت کے دلدادہ عوام الناس ہیں
سچ پوچھیئے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری،
استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام
خیال کرتے تھے۔ برخلاف اِس کے جرأت ایک حریف ظریف، ہشاش بشاش
خوش طبع آدمی تھے، ہمیشہ صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعۂ معاش اور جلب زر
کا ایک زبردست آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعہ سے اپنے تئیں اپنے مربیوں اور
سرپرستوں کا ایک دلچسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور اُن کے دل کو خوش کر کے
اُن سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے۔ اُن میں میر اور انشا کا ایسا علم و فضل اور قواعد شعر سے
ویسی واقفیت نہ تھی مگر پھر بھی اُن کا ایک طرز خاص ہے اور اُن کے کلام میں
ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جو رائے
اُن کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سُننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔
مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی

رئیس اور شاعر جمع تھے میر اور جرأت بھی تھے۔ جرأت نے جو غزل پڑھی اُس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں وہ ازراہ تبختر یا شوخی سے، جو کچھ سمجھیئے، میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب اُنھوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کر لیا کرو" مختصر یہ کہ جرأت کا پایۂ شاعری بہت بلند نہیں، دربار کے توسّل نے ان کو بھی مٹایا جیسا کہ اِنشا کو مٹایا تھا پھر بھی اِنشا کو اُن کے علم و فضل نے بچا لیا۔ اِن کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظم اُردو کی ترقّی میں بھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اُسی پر آنکھیں بند کئے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعوےٰ صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جسکی تکمیل متأخرین میں

**جرأت اور داغ** نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی۔ اِن دونوں شاعروں میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

**مصحفی (۱۱۶۰ھ تا ۱۲۴۰ھ)** شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلّص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے امروہہ کے رہنے والے تھے آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۰ھ میں دلی آئے۔ جہاں تکمیل علوم کی اور شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ اِن کو پڑھنے کا اسقدر شوق اور کتب بینی سے اسقدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے۔

انھوں نے سنہ ۱۱۹۵ھ ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کرلی تھی کیونکہ تذکرۂ میرحسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جنمیں معزز شعرا مثل انشاء اور میرحسن اور جرأت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ[12] برس دلّی میں رہ کر مثل اور شعرا کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریر آرائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں اُنھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادۂ مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوگئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے تھے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رہکر پھر دلّی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش اُن کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی۔ آزاد کی تحقیق کے موافق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسّی برس کی عمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔ شیفتہ بھی اپنے گلشن بیخار میں جو سنہ ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ اِن کو مرے دس برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ لکھتے ہیں۔ لہذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ برس کی ہوگی۔

**تصانیف** مصحفی اُردو اور فارسی دونوں کے پرگو شاعر تھے سنہ ۱۷۹۴ء کے پہلے انھوں نے دو دیوان فارسی مرتب کیے تھے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں۔ اور دوسرا اپنی طبعزاد غزلوں کا مجموعہ۔ اِن کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں یہ دونوں دیوان چوری گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مروّج ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اُردو شعرا کا فارسی زبان میں لکھا۔ شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جسمیں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعرائے اُردو
مصنفہ ۱۷۹۴ء

مصحفی کی شہرت زیادہ تران کے ضخیم اُردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے - آٹھ اردو دیوان انکی یادگار ہیں جن میں ہزارہا غزلیں قطعے - قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں - تذکرہ شعرائے اُردو جو زبان فارسی میں ہے ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ترتیب پایا - اوراب ملتا ہے - یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اسمیں تقریبًا ساڑھے تین سو شعرا کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانہ سے لیکر مصنف کے زمانہ تک تھے اُنھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں - کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ اُن کے شاگرد میر مستحسن خلیق خلف میرحسن کی خاص فرمائش سے لکھا گیا تھا - یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں -

خصوصیات کلام

سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زودگو تھے - جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کررہے ہیں - مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے - معمولی غزلیں خرید اروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لئے رکھ لیتے تھے - کہا جاتا ہے کہ اسی زودگوئی یا پُرگوئی سے اُن کے کلام میں ناہمواری پیدا ہوگئی کیونکہ پرگوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا - دوسری خصوصیت انکی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت اُستاد تھے - اور بڑے بڑے اُستاد اُن کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے - مثلاً میر مستحسن خلیق - ضمیر - آتش - شہیدی - عیشی وغیرہ - بلکہ اگر سچ پوچھئے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعرا بالواسطہ یا بلاواسطہ انھیں کے

شاگرد تھے۔ ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کو کسی سے فخرِ تلمذ حاصل نہ تھا۔ مگر وہ بھی محمد عیسیٰ تنہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے، اسی مائدۂ سخن کے ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا ہے اس سے بڑھکر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جتنے استاد اُن کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور حشو گربہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، ان کا کلام پاک ہے۔ ناسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجۂ تکمیل پر پہونچایا۔ مگر ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے۔ کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پروازی۔ کہیں فغاں کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی سادگی۔ کسی میں جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے۔ مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گو کہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور و استادی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کہے ہیں مگر پھر بھی مذکورۂ بالا اُستادوں کی وہ بات کہاں۔ مختصر یہ کہ غزل میں اُن کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی آخرہ نباہ نہیں سکتے یہی حال اُن کے قصیدہ کا بھی ہے۔ جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معانی کی بلندی تو

ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور زبان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک "بحر المحبت" میر کی مثنوی "دریائے عشق" کے رنگ میں بلکہ اسکی نقل ہے قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی سے ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن پر انھیں کمال حاصل تھا۔ انکی خصوصیات اُن کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخئیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

**مصحفی اور سید انشا کے معرکے** مصحفی اور سید انشا کے معرکے نہایت مشہور ہیں جنمیں مختلف ہجووں اور مذاق و تمسخر سے جو بسا اوقات فحش کی حد تک پہونچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے۔ یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبحیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اُس کتاب میں دیکھنا چاہیے یہاں بھی مختصر المصداق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتدا اس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میاں مصحفی پہلے شہزادۂ سلیماں شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشا پہونچے تو اُن کے سامنے اِن کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غزلیں اُن کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا اِسی اثناء میں اِنکی تنخواہ بھی کم کردی گئی جس کے متعلق اُنھوں نے ایک قطعہ لکھکر شہزادۂ موصوف کو گزرانا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق ۔۔۔ تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ بچپنیں سے اب پانچ ہیں اپنے ۔۔۔ ہم بھی تھے کسی روز وہ نیمی پچیس کے لائق
اُستاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر ۔۔۔ ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں لوک جھوک ہوتی اور ایک دوسرے کا مذاق اُڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جسکا مقطع تھا:۔

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ ۔۔۔ تھی اُسکی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

اس شعر کو انشا نے یا اُن کے یار دوستوں نے اُلٹ دیا اور کہا

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ ۔۔۔ رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں اُنگلی

اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے۔

سرِ مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن ۔۔۔ نے موے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر سید انشا نے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ غزل کا مطلع ہے

توڑوں گا خُمِ بادۂ انگور کی گردن ۔۔۔ رکھ دونگا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اور قطعہ اس طرح شروع کیا۔

سُن لیجیے گوش دل سے مری مشفقا یہ عرض ۔۔۔ مانند بید غصہ سے مت تھر تھرائیے
بلّور گو درست ہو لیکن ضرور کیا ۔۔۔ خواہی نخواہی اُسکو غزل میں کھپائیے
دستور و طور و نور یہ ہیں قافیے بہت ۔۔۔ اسمیں جو چاہیے تو قصیدہ سُنائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھکر ۔۔۔ مردے کی باس زندوں کو لاکر سنگھائیے

اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زباندان ہونے پر اعتراض

کیا ہے۔ مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا۔ اور انشا کی غزل میں جو ان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پر اعتراض جمائے۔ مثلاً

لے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے — تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پتلا — گر نور کا تُو ہووے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھیگا غزل میں — کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لئے وضع ہی ناداں — بیجا ہے خم بادۂ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ جھگڑا شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی ترجیح میں وہ وہ طوفان اُٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دِن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کر اُس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ اور آمادہ تھے کہ مارپیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اسکی پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے۔ بجائے ان لوگوں پر غصہ کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کے اُنھوں نے ان کی بہت خاطر و مدارات کی ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کیے اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا۔ ایک پُر تکلف بارات کی نقل بنائی جسمیں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڈا اور ایک گڑیا ہاتھ میں

جاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخِ کہن — لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پُر فتنہ مذاق سے لطف اُٹھاتے تھے۔ اکثر امرا نے اور خاص کر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں — کچھ اسکے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا — سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہم پر بھی چوٹیں کی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے مصحفی نے اِس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جسکا مطلع ہے۔

قسم بذات خدائیکہ ہے سمیع و بصیر — کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نمکخوار قدیم حضور کی نسبت کوئی بُرا لفظ کہے۔ یہ افترا سب انشا کا بنایا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے۔

اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور سید انشا کی خطا ثابت کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی بحیثیت شعر و شاعری ایک یادگار معرکہ ہے جو اس میں خلاف تہذیب نظمیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور ...

ایک خاص یادگار ہے۔

**رنگین سنہ ۱۱۶۹ھ تا سنہ ۱۲۵۱ھ**

سعادت یار خاں رنگین طہماسپ بیگ خان تورانی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے آکر چند دنوں لاہور میں حسین الملک میر منو خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اِس کے بعد دلی آئے جہاں پیشگاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگین نے شاہزادۂ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کرلی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہگری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدرآباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشا کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر اُن سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر اُنھوں نے یہ کہکر انکار کردیا کہ تم امیر آدمی کے لڑکے ہو تم کو شاعری نہیں آسکتی تمھارے لئے شہسواری ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پریوشوں کے جمگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب اسّی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے۔ مگر شیفتہ اور گارسن ڈیتاسی یہ اُن کی عمر اٹھاسی

اور سن وفات بارہ سو پچاس بتاتے ہیں -

**تصانیف** (۱) "مثنوی دلپذیر" جسمیں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے اسمیں شاہزادے ماہ جبیں اور رانی سری نگر کا قصہ ہے اسکا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۱۳ھ ہے جیسا کہ جرأت اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے -

(۲) "ایجاد رنگین" یہ بھی ایک مثنوی ہے اسمیں فحش قصے اور دلچسپ حکایات ہیں -

(۳) چار دیوان جن کے علحدہ علحدہ نام "دیوان ریختہ - دیوان ریختہ دیوان آمیختہ - دیوان انگیختہ" ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "چار عنصر رنگین" ہے -

(۴) "مثنوی مظہر العجائب یا غرائب المشہور" اسمیں بھی حکایتیں ہیں -

(۵) "مجالس رنگین" یہ ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور اسمیں اپنے زمانے کے شعرا کا حال لکھا ہے اور اُن کے کلام کی تنقید بھی کی ہے -

(۶) فرسنامہ مصنفہ سنہ ۱۲۱۰ھ اسمیں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور اُن کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے - پہلا دیوان سنہ ۱۲۲۵ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے - اس میں ۲۷ صفحہ غزلیات ۲ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰ شعروں کا ہے - دوسرا دیوان ۹۴ صفحہ کا غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے - تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں - اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے - چوتھا دیوان ریختی کا ہے - اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص

محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بدچلن عورتوں کی جن کو وہ عروس شیطان لکھتا ہے بول چال درج ہے۔

**ریختی سے کیا مطلب ہے اور اسکی ایجاد کے اسباب**

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اسمیں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں نساخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے۔ اور رنگین نے خود بھی یہ دعوی اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعرا علی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھا مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاکی تھا اور جن کا دیوان ۱۱۸۲ھ میں مرتب ہوا ہے ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جسکی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اردو کے جسمیں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشا اور رنگین کے طرز کے جن کا دار و مدار عیاشی و شہوت پرستی پر ہے۔ ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھکر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علحدہ علحدہ

زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ اِن دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لیے مخصوص ہیں جن کو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت اور فرق کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور اُن کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں۔ اکثر پرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں۔ پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کرلیں مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اسکے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہیں۔ اور اسکی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر ناآشنائی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کڈھب الفاظ اُن کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید براں ان میں چونکہ قدرتاً شرم و حیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ اُن کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں۔ جن کے نام لینے میں اُن کو شرم و حیا مانع ہو یا وہم و خوف دامنگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ اُن گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے۔ اس فرق مذکورۂ بالا سے انشا اور رنگین نے اپنی خاص اغراض کے لیے

فائدہ اُٹھایا اور اپنی نو ایجاد طرز کا دار و مدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بد اخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جبکہ لکھنؤ کے عیش پسند فرمانرواؤں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہو گیا تھا۔ شہر کے نوجوان اُمرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے اِن کو کھلم کھلا اور بلا خوف لومۃ لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی اُن کے جذبات اور اُن کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود انشا نے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہے۔ بہرطور یہ طرز اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اُسکی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میر امن کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔ جان صاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کر دی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں وہ دلّی گئے تھے اور وہاں سے تبلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علیخاں کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے اور یہیں رامپور

میں کچھ اوپر ستّر برس کے سن میں ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں انتقال کیا ۔

غرضکہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق وظرافت کے وہ اشعار جو دائرۂ تہذیب سے خارج نہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں ۔

شاعر شاہان دہلی
شاہ عالم ثانی
۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء

آخر زمانہ کے شاہان دہلی شعرا کے مربی بھی تھے اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے ۔ مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے ایک مثنوی موسوم بہ "مضمون اقدس" کے مصنف ہیں ۔ جسمیں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہے یہ مثنوی کا تاریخی نام ہے[۱] جس سے ۱۲۰۱ نکلتے ہیں ۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۲۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے چنانچہ اُن کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جسمیں نمکحرام غلام قادر کے ظلم وستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جانیکا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے ۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا ۔ میر ۔ نصیر ۔ اعظم ۔ انشاؔ ۔ زار ۔ ممنون ۔ احسان ۔ اور فراق وغیرہ یہ سب انکی سرکار کے دعاگو تھے ۔

مرزا سلیمان شکوہ
متخلص بہ سلیمان

شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے ۔ غلام قادر کی بغاوت کے بعد دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جواں بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے ۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے اخراجات کے لیے چھ ہزار ماہوار مقرر کردیے تھے ۔ نواب سعادت علی خاں اور

---

[۱] تاریخ صحیح نہیں نکلتی اس سے صرف ۱۱۰۱ نکلتے ہیں ۱۲

غازی الدین حیدر ۱۸۱۶ء تک انسے جھک کر ملتے تھے اور نذریں دیتے تھے۔ جب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجۂ مساوات چاہی شہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردی جنھوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مگر شوہر و بیوی میں ناموافقت رہی۔ ۳۰ سال لکھنؤ میں رہکر کاسگنج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے بعد کو اکبرآباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کئی بار دہلی آئے ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوے شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان ہیں۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوے اسکے بعد مصحفی اور انشا کو کلام دکھایا۔ دہلی سے جو باکمال لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیرانہ سے پیش آتے۔ لکھنؤ میں مشاعرے کرتے مصحفی قتیل۔ انشا میر حسن سب اسی سرکار کے دعاگو تھے۔ اِن کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانۂ جاوید کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

**اکبر شاہ ثانی**
**۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء**

ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوے۔ ۱۸۰۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا ظفر نے تاریخ کہی ؎

پے سالِ وفات گفت ظفر      عرش آرامگاہ عالی قدر

موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے

فکر سخن کیطرف توجہ کم تھی لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے میر نظام الدین ممنون غالب علیخاں نسید۔ شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے ۔

**بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر**

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں معزول ہوکر ملک برہما میں جلاوطن کئے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ اُستاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے بھی استفادۂ سخن کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا انکی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف دلّی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجتے تھے۔ اُنھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اُنکی شہرت کی اصلی بنا اُن کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان اُن کے شائع ہو چکے ہیں اُن کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اُنکی غزلیں اسقدر مقبول ہیں کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِن کے اُستاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں کہکر دے دیتے تھے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں اِن دونوں اُستادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ اُنکی بہت سی غزلیں

اُن کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق و غالب سے بالکل علیحدہ ہے معلوم نہیں کہ ظفر نے بحالت قید بھی مشغلہ شعر و شاعری جاری رکھا تھا یا نہیں اغلب ہی کہ یہ دلچسپ مشغلہ اُن سے نہ چھوٹا ہو اور کچھ اُن کا اُس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو سکیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آیندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے کلام بہت مزید ارسلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو اُن کے مصائب کی اصلی تصویر ہے ظفر اکثر جگہ مشکل بحریں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں رنگین اور جذبات دلنشین ہوتے ہیں۔

اس دَور میں مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گذرے ہیں جو اگرچہ اس پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں اُن کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائمؔ۔ قاسمؔ حسرتؔ۔ منّتؔ۔ ممنونؔ وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعرائے دور سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہگیا تھا مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

**قائم چاندپوری** شیخ قیام الدین نام تھا بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاصکر قطعات اور رباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغۂ توپخانہ تھے۔ شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے۔ انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کمیاب ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے۔

اسکے بعد رامپور گئے جہاں سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ اُنکی نسبت مصحفی لکھتے ہیں "در پختگی کلام وچستی مصراع غزل وردیہ قصیدہ ومثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استادراہ می رفت در بعضی مقام رجحان می جست" اور مرزا علی لطف اپنے تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں "مضموں تراشی اور معنی بندی میں معروف سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفریں کا نہایت مرغوب ہے"۔

منت

میر قمرالدین منت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایۂ عاطفت میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخرالدین رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کی اور مشورۂ شعروسخن میر نورالدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے بہت پُرگو شاعر تھے۔ ایک کلیات تخمیناً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد مثنویاں تصنیف کیں جسمیں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستاں کے جواب میں لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

درین عمر دہ مثنوی گفتہ ام     بہ آئین طرز نوی گفتہ ام

چو اشعار من در عدد میرسد     شمار قصائد بصد میرسد

بود شعر من در غزل سی ہزار     زیانصد رباعی گرفتم شمار

دلی چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی جو اُن کو کلکتہ لے گئے اور مارکوئس آف ہسٹنگز کے روبرو اُن کو پیش کیا۔ لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا۔ اِن کی مدح میں اُنکے

اکثر قصائد ہیں سنہ ۱۲۰۲ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر انکو حیدرآباد بھیجا وہاں پہونچ کر حضور نظام کی مدح میں انھوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام واکرام پایا۔ بعد واپسی حیدرآباد عظیم آباد میں مہاراجہ کلیسٹ رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رخ کیا جہاں پہونچتے ہی سنہ ۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے ہردم جو کہو کہ جائیں گے ہم

ولہ

آہ اب کثرت داغ غم خوباں سے مدام صفحۂ سینہ پر از جلوۂ طاؤسی ہے

ولہ

گر اس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوٰت سناؤں

ممنون — میر نظام الدین ممنون خلف میر قمر الدین منّت۔ ان کے آبا واجداد سونی پت کے رہنے والے تھے مگر ان کی ولادت دلی میں ہوئی۔ اور وہیں نشوونما پایا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اکثر لوگ ان کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں بحیثیت صدر الصدور کے رہے تھے۔ مگر پھر دلی آگئے جہاں سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی وگرامی چھوڑے۔ مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ ان کا دیوان کمیاب ہے اُس کے دیکھنے سے اُنکی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی — مرزا جعفر علی نام حسرت تخلّص، ابوالخیر عطار کے بیٹے تھے

دلّی میں پیدا ہوے اور ابتدائً عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔ شعر سے اُن کو فطری ذوق تھا اور اس فن میں اُنھوں نے کمال حاصل کیا۔ جب شاہ عالم ثانی سریر آرائے سلطنت ہوے تو حسرت بھی اور شعرا کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہوگئے۔ جب نمکحرام غلام قادر نے بدنصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کرکے لوٹ مار و بیگمات شاہی کی بےحرمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا۔ تو اس عبرتناک منظر کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت اُن کی ایک دردانگیز نظم ہے۔ حسرت دِلّی چھوڑکر فیض آباد آئے جو اُس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ اپنے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں اُنھوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی ہے جسمیں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدّت، پانی کی قلّت، سست رو گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کیگئی ہیں۔ فیض آباد پہونچکر اُنھوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوے تو حسرت نے انکی تہنیت میں ایک دوسرا قصیدہ کہکر اُن کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آگئے اور یہاں گھنٹا بیگ کی گڑھیا پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرأت بھی اپنے اُستاد کے پاس رہنے لگے۔ اور یہ دونوں شاگرد و اُستاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوکر اپنی پرکیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حسرت سب سے پہلے

مرزا احسن علیخاں بہادر کی رفاقت میں تھے اُس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے
مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امرا کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے ان کے
ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور اُنھوں نے اِن کے چڑھانے کے لیئے
بہت سی ہجویں کہیں اور تمسخر کے اشعار لکھے۔ سودا نے بھی اسمیں حصہ لیا۔ خود حسرت
نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی ہجو لکھی ہے جسمیں اُسکے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے
اُن کو شاہزادہ سلیماں شکوہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے۔ وہ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے
شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد بکثرت تھے۔ چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں
کہ "کثرت شاگردانش چناں ست کہ درصورت شناسی خود ہم حیران ست"۔ ان سب میں
جرأت اور نواب محبّت خاں محبّت بہت نامور شاعر ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ وفات
سنہ ۱۲۱۷ھ میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ تصنیفات میں ایک کلیات ہے
جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس،
قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غرض کہ اصناف سخن میں سے
ہر قسم کے نمونے اُس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر
قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

قدرت | شاہ قدرت اللہ قدرت میر شمس الدین فقیر کے برادر عزاد تھے اور کوئی عجب
نہیں کہ اُن کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناں
اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۰۵ھ میں مرشد آباد میں انتقال کیا۔ میر اُن کی
نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور اُن کو "عاجز سخن" لکھا ہے مگر میر حسن نے
اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں "سمند نظمش در میدان فارسی و ہندی

چالاک وچست وتصویر بینظیر معانیش در استخواں بندی الفاظ درست بندہ دیرا
ایک بار در مشاعرہ بلکھنؤ دیدہ ام"۔ اسی طرح مرزا علی لطف بھی اُن کے بہت مداح
ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا ۔۔۔ اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابرِ تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے ۔۔۔ شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

**ولہ**

مجھ کو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی ۔۔۔ آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

**ولہ**

سینہ اُس کا ہی دِل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی ۔۔۔ تیر بیداد جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہی

**ولہ**

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ ۔۔۔ گر صدائے چنگ ہی یا نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے ۔۔۔ اب وداعِ ننگ ہی اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اسطرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے ۔۔۔ کیا ہی ملکِ روم ہی کیا سرزمینِ روس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی ۔۔۔ اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور ۔۔۔ شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے ۔۔۔ چل دکھاؤں کیا تو اپنی آز کا محبوس ہے
لیگئی اکبارگی گورِ غریباں کی طرف ۔۔۔ جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے ۔۔۔ یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حکمتِ دنیا سے آج ۔۔۔ کچھ بھی یاں ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہن جام مے یہ فرقۂ سالوس ہے

**بیدار** میر محمد علی عرف میر محمدی متخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ کے مریدوں میں تھے۔ آخر عمر میں دلّی سے آگرہ چلے گئے جہاں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے ہمعصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں ؂

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن — جی سے نہ ترے غبار نکلا

**ولہ**

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار — گل جدا، سرو جدا، نرگس بیمار جدا

**ولہ**

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا

**ولہ**

چھوڑ کر کوے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو — جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا

**ولہ**

ربط جو چاہیے بیدار سو اُس سے معلوم — مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

**ہدایت** ہدایت اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا صاحب دیوان ہیں۔ اور بقول مرزا علی لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کمالات شاعری کے معرف ہیں۔

**فراق** حکیم ثناء اللہ خاں متخلص بہ فراق ہدایت اللہ خاں ہدایت مذکورۂ بالا کے بھتیجے تھے کسب سخن اور کسب باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے مشاہیر عصر میں سے تھے اور دلی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے مصحفی اور میر حسن نے اُن کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے اُنھوں نے تحصیل طب کی اور جب میں شاہجہاں آباد میں تھا تو مجھ سے اور اُن سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

**ضیا** میر ضیاء الدین ضیا دہلوی سودا کے معاصر تھے۔ دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ اُن کے شاگرد ہو گئے پٹنے ہی میں انتقال کیا میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معرف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نا معقول را مقبول دلہا ساختن کار اوست" میر حسن ابتدا میں انھیں کے شاگرد تھے ان کو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا نمونۂ کلام یہ ہے۔

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

کسی دشمن کی بھی یارب گذرے شب جدائی کی ۔ کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اک دن گذرتا ہے

ولہ

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں ۔ بات منہ پر آرہی ہے اور لب ہلانا منع ہے

ولہ

اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے ۔ یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

ولہ

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا ۔ آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جبتک تو ہم کو بھی جوابِ صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رُسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگِ خلق
اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا — شیخ بقاء اللہ اکبر آبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے دلّی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اُردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں حزیں اور اُردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا۔ میر و سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر چوٹیں چلتی تھیں چنانچہ جب ان کے دو آبہ کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انھوں نے جل کر کہا ؎

میر نے گر ترا مضمون دو آبے کا لیا ۔ اے بقا تو بھی دُعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کردے ۔ اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

اِک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ؎

✔ پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر — اور بستی نہیں یہ دِلّی ہے

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور ٹھٹھول میں اس طرح دکھایا ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تو تو کہے ہے اِک ہی ہی

یعنی ایک کے کلام میں روکھی پھیکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض ظرافت و تمسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال کا شوق کیا تھا اس سے اُن کا دماغ خراب ہو گیا آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر ۱۲۰۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے صاحب دیوان ہیں۔

**حزیں** میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ بزرگ اُستاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہو ہو نہیں سکتی حزیں — حضرتِ اُستاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

مصائب روزگار سے تنگ آکر دِلّی سے پٹنہ عظیم آباد پہونچے۔ وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ ایک دیوان یادگار ہے جسمیں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیئے جاتے ہیں۔

کچھ کہا شاید اُسنے قاصد سے — دل میں میرے وہ اضطراب نہیں
حال لے قاصد مرا کچھ کہ تو جاتا ہے کچھ — اس طرح سے اُس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

ہر نصیحت میں تری مانونگا ای ناصح پر ایک ۔۔۔۔ دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا نا چاہئے

**بیان** خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلّی میں پیدا ہوئے مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مولانا فخرالدین کے مرید تھے ۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور نواب آصفجاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے۔ اِن کی وفات کی تاریخ ہے "اُستاد از جہاں رفت" میر حسن اپنے تذکرہ میں اِن کے بڑے معرف ہیں لکھتے ہیں "شاعر عذب البیان از خوش گویان زبان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذۂ مرزا مظہر جانجانان ...... زتیج نامہ از و مشہور ست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" نمونۂ کلام یہ ہے۔

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا ۔۔۔۔ سوائے اسکے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

مصلحت ترک عشق ہے ناصح ۔۔۔۔ لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں میں عرش پہ ای نالہ جا پہنچ ۔۔۔۔ کانوں تلک تو اُسکے تو ای نارسا پہنچ

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیان اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف مُنھ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اِس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میرا جس کے پاس

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو ۔۔۔۔ اِک بے خلل مکاں ہو بس میں ہوں اور تو ہو

وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تمسے ہمشیر ۔۔۔۔ شام سے لیکے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

بیان کون ہے اب تلک پوچھتے ہو ۔۔۔۔ تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی ۔۔۔۔ ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

**راسخ** شیخ غلام علی راسخ شاگردِ میر سنہ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے - شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اشرف کو کلام دکھاتے تھے مگر آخر میں باقاعدہ طور پر میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب اِن کا بڑا خیال کرتے تھے - سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، دِلّی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے - اس کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں بہت زور و شور سے شروع کر دیا - چہتر برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۳۸ یا سنہ ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی - زبان پاکیزہ اور طرزِ بیان صاف و سادہ ہے - سادہ اشعار کے ساتھ رنگین شعر بھی بہت مِلتے ہیں - جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے -

# باب ۸

## اساتذۂ لکھنؤ

### ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے

شاعری کا مرکز ترقی دلّی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آگیا۔ اس کے اسباب مختصراً یہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصر سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازۂ حکومت بکھر گیا اور درختِ اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ دُرّانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی بدبخت اور نمک حرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور اُن کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سیندھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی چنانچہ اُن کے اُس دردناک قصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں لکھا تھا چند اشعار یہ ہیں ؎

شاہ تیمور[1] کہ دارد نسبت با من | زود باشد کہ بیاید بمددگاری ما

---

[1] تیمور شاہ والی کابل ان کے بہنوئی تھے ۱۲۔

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من است    ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
راجۂ و راؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر    حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستورمن اند    چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امرائے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بدامنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میر، سودا، میرحسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جو اُس وقت ان کا قدرشناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدردانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں وظائف انعام و اکرام مرحمت ہوے۔ اور ان کی نازک مزاجیاں اور بددماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں۔ بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی سلسلۂ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اور اُمرائے وقت نے اکثر شعرا کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور اُن کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ داران شعر آزاد مزاج اور خوددار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر مابعد کے زمانہ میں جبکہ

شعرا اپنی عزت و آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت بُرے نتائج سرزد ہوے مرتبۂ شاعری پست ہو گیا۔ شعرا نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا۔ مثال کے لئے میر و سودا۔ اور انشا و مصحفی کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں صاحب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے تھے۔ وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں کرتے تھے برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ درباداری کے اثر سے متاثر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رہ گئی۔

**لکھنؤ کا طرز شاعری** اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دلّی والوں نے روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں اُنھوں نے پھیلایا اُن لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر الخلافت ہو جانے اور شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت آ جانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا اور شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے۔ سودا کے بُلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے اُن کو طلب کیا اور ایک خوبصورت حیلہ سے اُنھوں نے اس کو ٹال دیا[1]۔ شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ اُمرا اور رؤسا اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھکر اور

[1] دیکھو صفحات ۱۲۸ و ۱۲۹۔

سُن کر لوٹ جاتے تھے مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل بڑھتے تھے۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جُدا جُدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور نُدرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور اُن کے بعض مشہور شاگرد بھی اُن کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوے یہاں تک کہ زمانۂ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی ۔

**طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور اُن کا تقابل**

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پُر اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے تخیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ اور اُن کے متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنایع بدایع پر صرف کر دی یعنی الفاظ کی مصوری ایک بڑے اسلوب سے کی شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی الفاظ

منتخب کئے جو کسی پہلو سے مراعات النظیر میں شامل ہو سکتے تھے۔ مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ گو کتنے ہی مناسب اور موزوں ہوتے مگر ان کو جگہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کردیا جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ سے وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دارومدار رہ گئی۔ اور الفاظ کے قربانگاہ پر درد، واثر، جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ اور اس کمی کو اغراق۔ غلو۔ اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ روح کے اہتزاز کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی۔ اس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوشنما گھروندا ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ اُنھوں نے غور سے کیا تھا۔ صائب کی طرح مثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اُردو میں آکر وہ محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھندا بن گئیں۔ اِس قسم کی بے تابو تخییل پہلے شعرا کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنؤ کا طرز شاعری باغ کو تو

متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اُس کا وہی حال ہے جیسا کہ انگریزی میں پوپؔ اور اُس کے متبعین کی شاعری کا ہے جسمیں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد و اثر مطلق نہیں جس سے گو دماغ لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جدت پسند طبیعتیں اُن سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تمسخر انگیز ہوگئی۔ بیہودہ اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل پھر گیا اور اب وہ انیسؔ و دبیرؔ کی جادو نگاری اور غالبؔ و مومنؔ کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

ہر دور کی شاعری اُس وقت کا آئینہ ہوتی ہے یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ ناسخؔ اور اُن کے شاگردوں کا کلام اُس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے اُنکی غزلوں سے اُس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرایش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی اُن کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دلی والوں کے یہاں نہیں ہے۔ دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفیؔ اور جراتؔ کی نکالی ہوئی تھی۔ اِسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بدمزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہوجاتا ہے۔

**تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ** اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ

ورعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔جسکی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور اُن کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا۔یہی لوگ اصطلاح میں زباندان کہلاتے ہیں۔رشک، بحر، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علی شاہ اختر اسیر وغیرہ یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ ومحاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے تھے۔

اس چھان بین اور دقت نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔اسی وجہ سے زبان میں ایک کرختگی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ جو الفاظ ومحاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کیے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اِس جدید طرز لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے۔لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ ومحاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقۂ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے۔نیز یہ کہ اُن کے پسند کردہ الفاظ ومحاورات زیادہ تر لطیف وفصیح ہوتے ہیں۔یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف ونحو تک پہونچ گیا اور تذکیر وتانیث میں فرق کیا جانے لگا۔یعنی بعض الفاظ جو اہل لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔اور بعض جو وہاں مؤنث ہیں وہ یہاں مذکر بولے جاتے ہیں۔یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ

[illegible] محدود ہے [illegible] کی ابتدا میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔اُن کے بعد سے

یہ قضیہ ابتک چلا آتا ہے اور ان دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔

**شیخ امام بخش ناسخ**
**متوفی سنہ ۱۲۵۴ھ**
**مطابق سنہ ۱۸۳۸ء**

شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ زبان اُردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے ۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمّٰی خدا بخش خیمہ دوز نے جو لاہور کا ایک دولتمند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا ان کو متبنی کر لیا تھا اُس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے اِن سے محبت کرتا تھا ۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی تبنیت کو غلط ٹھہرا کر اِن کو اپنے بھائی کا غلام بتایا رفتہ رفتہ کچھ مصالحت کی صورت پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی ۔ یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہونچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا ۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے ۔ مثلاً

(۱)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام ۔۔۔ پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے ۔۔۔ میراث نہ پا سکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام ۔۔۔ میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوے باطل سے ستمگاروں کو ۔۔۔ حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علماے فرنگی محل سے پڑھیں

جو لکھنؤ میں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری
میں انکو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میر کے پاس بغرض شاگردی گئے تھے
مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ
ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم
نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاولت
بڑھتی جاتی تھی اوسیقدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر اُستاد
مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جنمیں سے
اکثر مرتبہ کلام میں اُن سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے
تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔
دِن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اُس وقت تقریبًا پانچ سیر غذا نوش جان
کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے اُن کے حریف اور با مذاق لوگ دُم کٹے بھینسے
کی پھبتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے ورزش سے فراغت کرکے
نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے۔ اُسکے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا
کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر
و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی
غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو
دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے۔ اِن کی صحبت اور باتوں میں بڑی
کشش تھی اسواسطے کہ باوجود شاعرانہ بد دماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے
ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے۔ خود بھی

کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدردانوں کی قدرشناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے مشہور ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں نواب آغا میر نے سولا کھ روپیہ اِن کو دیا تھا۔ وہ اُنھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انہی کے یہاں ہے۔ چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا اُنھوں نے تاریخ کہی

دزد در خانۂ ناسخ چو زده نقب اشب — نہ زر و سیم نہ بُد مِس خجل آمد بیروں

بہرِ تاریخ مسیحی چو بریدم سرِ زد — دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

اس سے ۴ کے تخرجہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں ۔

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ وجہ یہ تبلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف اُن کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور یہ کہکر خطاب واپس کردیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہان دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکارِ انگریزی کا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لیکے کیا کروں۔ اِس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چند روز قیام کیا۔ یہاں راجہ چندولال دیوان سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن نے اُن کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کے قدر و منزلت کی جائیگی۔ وطن کی محبت سے اُنھوں نے اسقدر دور و دراز جانے سے انکار کیا۔ مشہور ہے ایک مرتبہ اور اُنھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جسکے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو اُن کے سرپرست اور قدردان آغا میر کے دشمن تھے

ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ایک مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخرکار حکیم مہدی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۷ھ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہکر ۱۲۵۴ھ ہجری میں انتقال کیا میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی ؎

وا شعر گوئی اوٹھی لکھنؤ سے

**تصانیف** ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ھ ہے۔ اسکا نام دفتر پریشان رکھا۔ اسمیں غزلوں رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۴ھ ہے[۱]۔ ان کے دیوانوں میں جو تاریخیں ہیں وہ اس لیے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعرا اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے ہجو اور مذاق کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں[۲]۔ ان کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا نام

---

[۱] فقیر مؤلف کے پاس جو نسخہ کلیات ہے اسکے آخر میں یہ عبارت ہے "الحمد للہ کہ بفرمائش شاہزادۂ والا جاہ مرزا فرخندہ بخت بہادر دام اقبالہ کلیات رئیس شعرائے زمان سر دفتر بلغا آوان علم و عمل الشیخ شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ در دیوان اول مسمّٰی بہ "دیوان ناسخ" در متن و دیوان دوم مسمّٰی بہ "دفتر پریشان" بر حاشیہ و دیوان سوم مسمّٰی بہ "دفتر شعر" د ہر ردیف ملحق بہ دفتر پریشان بتاریخ چہارم جمادی الاول ۱۲۶۲ھ در مطبع مولائی واقع بازار راجہ ٹکیت رائے منطبع گردید۔"

[۲] آب حیات میں ڈھونڈھ کے ایک تاریخ انکی نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال معلوم ہوتا ہے۔ میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منھ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

"نظم سراج" ہے جو تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۵۴ نکلتے ہیں یعنی اس سال اُن کے شاگرد رشک نے انکی وفات کے بعد اُس کو شائع کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہی مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر

شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک انکی قادر الکلامی جو انکی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انھوں نے ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جنکو اپنے بعد وہ چھوڑ گئے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلم الثبوت اُستاد تھے جن کو زبان اُردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی شعر کی آرایش ظاہری کما حقہٗ کرتے تھے لکھنؤ کے حلقۂ شعرا میں اُن کا بہت بڑا اثر تھا اور ابتک کسی متنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و میر کے زمانہ کی یادگار رہگئے تھے اُن سے اجتناب کرتے تھے برخلاف ان کے مصحفی زمانۂ قدیم کے بہت بڑے متبع تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ اُنھوں نے الفاظ کی تلاش و جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بدنصیبی سے کہیں کہیں ایسے مغلق اور ادق الفاظ فارسی عربی داخل کرنا چاہے جو غزل کے شایان نہیں ہیں اسی وجہ سے اِن کا کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہی مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں

اُن کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ

ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثانوی کے ان کے یہاں غرض اصلی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی مہتات میں شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ انکی غزلیں صائب اور مرزا بیدل کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ ناسخ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

غیر کوثر کسی دریا کا میں سباح نہیں ۔ بیشۂ شیر خدا بن کہیں سیماح نہیں
ظلم طول شب فرقت کے تطاول نے کیا ۔ دادرس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں
بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلف یار پر ۔ دوڑتا تھا جس طرح ثعبان موسی مار پر
دیکھیو ناسخ سر شیخ معمم کی طرف ۔ کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر
کیونکر اے ناسخ خوار عجل دشمن ہو نہ خوار ۔ کیسے موسیٰ کا علی شیر خدا ہارون ہوا

معمولی کلام کا انداز یہ ہے۔

روے جاناں کا تصور میں جو نظارا ہوا ۔ دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا
وہ مہِ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا ۔ اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا
محفلِ مے میں جو آیا تو براے میکشی ۔ تھا جو شیشہ جوش مے سے ایک فوارا ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف ۔ سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا
شعلۂ آہ سے جل گئی جو انکی زلفِ عنبریں ۔ دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا
بیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا ۔ بیٹھ پر بارِ گنہ کا جمع پشتارا ہوا

دو پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں — ہاتھ میں جام مے گل رنگ سا انگارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا — حوض میں روشن برنگ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہو
قتل آج اسکی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں — تاریخ گوئی میں اُن کو خاص ملکہ تھا۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے بعض تاریخیں بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً کسی نے اُن کے خطوط چرائے تو کہا ؎

سیاہ ہیچو قلم باد روے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا ؎

صد حیف تلف چہار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ؎

شدہ نوشہ وزیر من امروز

جب اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ؎

صبح طالع شد برآمد آفتاب

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو اُنھوں نے تاریخ کہی ؎

اُفتاد حکیم از وزارت — تاریخ بطرز نو رقم کن
از جاے حکیم ہشت برگیر — سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

تصنیف نہیں کہا — تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں اُنھوں نے کوئی توجہ نہیں کی درحالیکہ اسکی ترتیب میں درد و اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اُن کا شوق شکوہ الفاظ کا اس کا ممد و معاون ہوتا۔ ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ اِن کی

فطری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چاپلوسی کی اجازت نہ دی ہو۔ وہ تصوف سے بھی بیگانہ نہیں۔ اُن کے بعض اشعار جو صوفیانہ کہے جا سکتے ہیں اُن میں بھی خود انھیں کا رنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح وظرافت کا بھی کہیں اُن کے کلام میں ذکر نہیں۔ اُنکی ہنسی بناوٹی ہوتی ہے اور مذاق پھس پھسا۔ کہیں کہیں مذہبی حملے اور طعن وتشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اُس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ اُن کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے۔

**نقائص کلام** کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پر اُن کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا اُن میں پتہ نہیں۔ اُن کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔ نہ اُس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے۔ اشعار ٹھس اور بے لوچ ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں۔ تصنّع اور تکلف۔ فارسی تشبیہات جو اُردو کا جامہ پہن کر بدنما ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی مغلق الفاظ جنکی اُردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ظاہری آرایش کو مقدم سمجھنا معمولی اور پست خیالات کا بیموقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرقہ کا بھی الزام اُن پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

**ناسخ کے کارنامے** ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے۔ مگر غور سے دیکھئے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ مگر اُنھوں نے اُسکی ابتدا کی اور اپنے کلام میں اُسکو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اُس زمانہ کے ایک مُتموِل اور بارسوخ رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور اُنکی سرکار میں

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے۔ ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہوگئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ اور دل میں جوش بڑھ گیا۔ غرضکہ مرزا حاجی کی مہربانی سے اُنکی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اُردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہوگیا۔ مگر دلی میں عرصہ تک وہی پرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جنکی ردیفیں اکہری مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ نے۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تغیر کیا مثلاً آئے ہے جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں۔ دکھائیاں وغیرہ ترک کردیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بہت متمائز فرق تھا جو ابھی تک کسی قدر باقی ہے۔ نامہذب اور فحش الفاظ جو بعض قدما کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا۔ ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو اُن کے زمانہ میں عمل میں آئے۔ تذکرۂ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں دی ہوئی ہے۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی عمل درآمد پر مجبور کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے اُن سب

تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا ۔

شاگرد ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں :۔

وزیر برق رشک بحر منیر مہر نادر آباد طاہر

برق فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے ۔ بادشاہ کے ساتھ اُن کو بہت محبت تھی چنانچہ جب بعد انتزاعِ سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ بھی اُن کے ہمراہ تھے جہاں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کا اُن کے حسب حال ہے ۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مَر کر اُٹھے

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار اُن کے عالی خاندان اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز اُن کے اخلاق و سیر چشمی کی وجہ سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ پُرگو شاعر تھے اور اپنے استاد ناسخ کے متبع تھے ان کے کلام میں بھی مثل ان کے اُستاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ ہے ایک ضخیم دیوان چھوڑا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت مؤثر و درد انگیز ہیں۔ جلال اور سحر ان کے دو مشہور شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

اذاں ہی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا     کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ولہٗ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو     دیکھ لینا مجھے تم موسم گُل آنے دو

ولہٗ

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی     اچھا ہوا جو خاک میں تم نے مِلا دیا

ولہٗ

آتا نہیں قرار دلِ بیقرار کو     غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

**بحر** شیخ امداد علی بحر شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخ کے ہمنام کے بیٹے تھے عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گذری۔ آخر عمر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور اُنکی سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں چھپتر برس کی عمر میں سنہ ۱۳۰۵ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ اِن کے دیوان کی ترتیب اِن کے دوست نواب سید محمد خاں رِند شاگرد آتش نے کی۔ ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اسقدر تصنّع اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف وسلیس اور پُراثر بھی ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے اُستاد تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد لکھنؤ کے دَورِ متوسط کے شعرا میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاصکر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف وسادہ اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں۔

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا	میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ولہٗ

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ	اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

ولہٗ

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں	کچھ تو کبھی ہو دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

ولہٗ

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں	دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

ولہٗ

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی	پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد | مرزا مہدی حسن خاں متخلص بہ آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے ۱۲۲۸ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلۂ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بڑا شوق تھا مقررہ اوقات پر اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے پر گو شاعر تھے دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جنمیں سے ایک دیوان موسوم بہ "نگارستان عشق" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن"، جس میں ناسخ و آتش کی ہمطرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور ہے جس سے ان دونوں اُستادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں البتہ کہیں کہیں کوئی پھڑکتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

**خواجہ وزیر** خواجہ محمد وزیر متخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ خاندان ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی۔ فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے۔ سو روپیہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر سنہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادۂ تاریخ خوب نکالا ہے

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کر کے شائع کیا اور اُس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے سنہ ۱۲۶۳ فصلی مطابق سنہ ۱۲۷۱ھ اُس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔

ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا ہیں۔ خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو اُن کے اُستاد کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے اُستاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ محبوب شاگرد یہی تھے۔ مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

چلا ہے لو دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمیں کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ولہٗ

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ولہٗ

نہ کر نظر مرے جرم و گناہ بیحد پر — الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھکو دیکھکر محتاج — یہ اُن کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

رشک — میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے بزرگون کا وطن فیض آباد تھا مگران کی نشو و نما لکھنؤ مین ہوئی اور یہین ان کی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے مشہور شاگرد تھے زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ" پر مبنی ہی جو زبان فارسی مین ہے اور اُردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اُس میں کیگئی ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔ وہ ان کی زندگی ہی مین مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اُس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے دو دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ) ہیں۔ رشک کا بھی رنگ وہی ہے جو اُن کے اُستاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اُس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں۔ رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ اپنے بعد اُنھوں نے بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں منیر مشہور ہیں منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے

مگر اُن کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الٰہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلّٰی چلے گئے تھے اور وہین ۱۲۸۴ھ میں ستّر برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے اُستاد کے زمانے میں بھی اسی بات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ اِن کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اُسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے مثلاً

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپی (آپ ہی)

دل ہی میں سُراغِ درِ دلدار ملے گا

بہت پُرگو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ "لگاؤ۔ تاؤ" وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا اُنھوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے۔ نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں — وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

پرزوں میں دستخط کروں کیا حال — ایک دو تین چار تاؤ نہیں

گنگ کو بحرِ غم سے کیا نسبت — یہ وہ دریا ہے جسمیں ناؤ نہیں

ابکی جاڑے ہیں اور نالۂ و آہ — اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں

چاول الماس گوشت لختِ جگر — فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں

میرے کھانے سے کیوں خفا ہو کباب — پاؤ روٹی ہے نانپاؤ نہیں

ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبائے  بارِ غم پر مرا دباؤ نہیں

یہ زمینِ غزل وہ ہے اے رشک

جس میں ذرّہ کہیں بھراؤ نہیں

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا اسکی کمی کسی ظریف نے پوری کردی اور خود انھیں کی طرف منسوب کردیا۔

دُور سے چھیچھڑے دکھاؤ نہیں

رشک بیٹھا ہے بَن بلاؤ نہیں

مہر

مرزا حاتم علی بیگ متخلّص بہ مہر سنہ ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوے۔ وہ ایک مشہور خاندان صفہانی کے نونہال تھے۔ اُن کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں علی گڈہ کے تحصیلدار تھے۔ اُن کے دادا مرزا مراد علی خان بعہد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوے۔ وہ کسی زمانہ میں رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ اُن کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلّص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوے تو خود اُنھوں نے زانوے شاگردی ناسخ کے سامنے تہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہوگئے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں سرکاری امتحان پاس کرکے چنارگڈہ ضلع مرزا پور کے منصف ہوے چنانچہ اُن کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

ازبسکہ سوزِ ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم

منصف چنار گڈھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالت العالیہ ہائیکورٹ کے وکیل بھی تھے ۱۸۵۷ء کے غدر میں اُنھوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی جسکے صلے میں خلعت فاخرہ اور دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوے۔ اس کے بعد وہ آگرے آگئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹی بھی کی ہے ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں اُنکے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔

مہر مذہباً امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی مثلاً غالبؔ انیسؔ دبیرؔ غلام امام شہیدؔ صباؔ منیرؔ وغیرہ چنانچہ غالب کے اکثر خطوط اُن کے نام اردوے معلّی میں موجود ہیں۔ مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو اُن دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے اِن کے شاگرد ہوے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

**تصانیف** مہر کی اکثر تصانیف زمانۂ غدر میں تلف ہوگئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں۔

(۱) دیوان اُردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "خیالات مہر" (۱۲۸۰ھ)۔ اِس کو اِن کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شائع کرادیا ہے۔

(۲) "پیرایۂ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔

(۳) "ایاغ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) "مثنوی داغِ نگار" جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) "داغ دل مہر" واسوخت۔

(۶) "مثنوی شعاع مہر" ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی جسکی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

اِن کے علاوہ "شبیہ عشرت" "ضبط انتقام" "ہمدم آخرت" "بیان بخشایش" "عید قیصریہ" "پنجۂ مہر" "توقیر شرف" اور اور کچھ نظمیں بھی اُن کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پُر گو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں مہر کا مرتبہ بلند ہے۔ اُن کے کلام میں سلاست وروانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے بعض اشعار اُن کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پُرلطف ہوتے ہیں۔

**منیر** سید اسمٰعیل حسین متخلص بہ مُنیر خلف سید احمد حسین شاد شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اُردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اُس میں اُنھوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کیے ہیں۔ پہلے ناسخ سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ اُن سے ملنے گئے اور شاگرد ہو گئے اور اُنھی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور اُنکی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشدآباد، اور الٰہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے یہاں کی دلچسپیاں اُن کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا

ذکر اُن کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفرالدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ نواب سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہوے اور اُن کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے۔ لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجمل حسین خان کی فرمائش سے فرخ آباد گئے جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں مہاراجگان دھولپور اور الور نے بھی اُن کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر اُنھوں نے باندے میں ملازمت کر لی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں اُن پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر بعہد نواب کلب علیخاں رامپور میں قیام کیا اور وہیں کی خاک میں ۱۸۸۱ء میں آرام کیا۔

**تصانیف** تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) "منتخبات عالم" (۲) "تنویر اشعار" (۳) "نظم منیر"۔ مثنوی "معراج المضامین" جس میں ائمۂ معصومین کے کشف و کرامات بیان کیے ہیں انھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُر گو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرثیے میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بڑے زوردار کہتے تھے اور قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی بہت زورِ طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے اُستاد ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہیے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخئیل ہے قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں، غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر

کہ منیرؔ کا مرتبہ اُس زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے ۔

**آتش متوفی ۱۲۶۳ ہجری** خواجہ حیدر علی آتشؔ خلف خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی ۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی ۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بُری صحبت میں بیٹھکر مزاج میں شوریدہ سری اور بانک پن آگیا ۔ نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے ۔ یہاں اُس زمانے میں مصحفی اور انشا کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے ۔ اسی کو دیکھکر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا ۔ مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہونچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے ۔ ناسخ اور انشا کی طرح ان کی استعداد علمی درجۂ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی ۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں ۔ اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا ۔

ناسخ اور آتش کی طرز زندگی میں بھی مثل اُن کے کلام کے بیّن فرق تھا آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جسمیں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا ۔ وہ حُسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوے تھے ۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے ۔ مگر اسمیں بھی بانکپن کو دخل تھا ۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لیجاتے تھے ۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی کبھی کسی امیر کی اُسکی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی ۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا ۔

اسی روپیہ مہینا بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ معالیخاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جسمیں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے مزاج میں انتہا درجہ کی وضعداری اور خودداری تھی۔ اُمراسے بہت نوک کی لیتے تھے۔ مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوے تھے۔ آخر میں ان سے اور اِن کے اُستاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا اصلاحِ لینا بند کر دی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانبداران ناسخ دوسرا طرفداران آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں اُستادان سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دیکر کہتے تھے البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرۂ تہذیب سے باہر نہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعر نمونتاً لکھے جاتے ہیں :۔

ناسخ ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب      بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اس پر آتش نے یہ کہا۔      آتش ؎

کیوں نہ ہے ہر مومن اُس ملحد کے دیواں کا جوب      جسنے دیوان اپنا ٹھہرا یا ہے قرآں کا جوب

آتش نے ایک مرتبہ کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں      ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں

ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں — ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

مگر باوجود اس سب کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی ع

خواجہ حیدر علی اے وا مرد ند

طرز کلام — کلام میں اُن کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کیے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انکی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد واثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ خوق البطرک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرہ کی بول چال ہے جسمیں ابتذال نہیں ہے شعر بآسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں تلاش الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک وصاف ہیں +

**تصانیف** پہلا دیوان خود انھیں کی زندگی میں شایع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کرکے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ انھوں نے سوائے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی

**نقائص کلام** بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ انکے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں پختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ اُنکی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے۔ مثلاً المضاف بجاے المضاعف، حلوۂ بیدود بجاے حلواے بیدود، کفارا بجاے کفّارہ تبشدید فا، مطالع بجاے مطالعہ وغیرہ۔ اسکے جواب میں انکی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ مروجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا۔ اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت اچھا ہوا کہ اُنھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوچ کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھرمار کر دی۔

**ناسخ اور آتش کا مقابلہ** دونوں زبان اُردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے، اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا تو اُس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح

دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے[2] ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت مؤثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں

[1] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں آتش کے حال میں جو ان کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی، فرماتے ہیں "مردم آن دیار آتش و ناسخ را کلا از اساتذۂ مسلم انجامات قریب ہم انگارند و ہر دو را ہموزن شمارند و قباحت این تحقیق لایخفی علی من لہ حظ من الفہم" اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً اُن کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق اُن کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں "دیوانے دیگراز افکار و قادش فراہم آمدہ و ہم در شہر رسید اما خاطر آسودگی جو از انتخاب آں بایستاد" اس سے ثابت ہوتا ہی کہ دوسرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔

[2] مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہی یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار | زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں | خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم | ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس "چیزے دگر" کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن، اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ "ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"۔

آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ اُن کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے آتش کے اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ اُن میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور اُن کا کیرکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جسکی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات و تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اسمیں مطلق نہیں ہے زبان کی صحت و صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے ۔

**شاگرد** آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔ رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب مرزا شوق اور آغا حجو شرف۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوے میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہگیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں اُس بُت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئی دوست
اُس بلا جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئی دوست

مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں یکجا دکھا رہے ہیں خزاں و بہار رنگ

یہ کیفیت اُسے ملتی ہی ہو جسکے مقدر میں ٭ مے اُلفت نہ خم میں ہی نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

پر کترتا ہی مرے صیاد تو کاٹ اسطرح ٭ حسرت پرواز بھی اُڑ جائے بال و پر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر لو دو گام ٭ کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ٭ ہمکو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا ٭ زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشان سے نہ تھے ٭ زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ ٭ قناعت بھی بہار بیخزاں ہے

سفر ہی شرط مسافر نواز بہتیرے ٭ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

نقش پائے رہگاں سے یہ صدا ہے آرہی ٭ دو قدم میں راہ طی ہی شوق منزل چاہیئے

افسوس ہی فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی ٭ سر پھوڑ کے مرجائیے اس کوہکنی سے

**رند** نواب سید محمد خاں متخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق تھا (ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے) اسواسطے بہو بیگم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھلاتے اور وفا تخلص کرتے تھے سنہ ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو گلدستہ عشق" کے نام سے مشہور ہے سنہ ۱۲۴۸ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان انکی وفات کے بعد شائع ہوا تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن باوجود کی

مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اُٹھاتے تھے۔ اپنے اُستاد آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادۂ حج روانہ ہوے۔ مگر راستہ میں بمقام ممبئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جسمیں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے۔ مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت و تصوف کی جھلک ہے غرضکہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

ولہ

پھینکدینگے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ولہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کرو۔

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست ؛ کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست (حافظ)

ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم ؛ تو عشق گلی داری من عشق گل اندامے (سعدی)

او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

ولہ

دو چار گام یاں سے ہو دولتسرا ے دوست ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

## قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے گزرنی ہے جو کچھ گزر جائیگی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائیگی

**خلیل** میر دوست علی متخلص بہ خلیل سید جمال علی کے صاحبزادہ تھے اور بدولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔

**نسیم** پنڈت دیا شنکر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوے اور عین جوانی کی حالت میں ۱۲۶۰ھ میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بعہد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے اُن کو شعر و سخن سے شوق تھا چنانچہ اکثر اساتذۂ اُردو و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوے۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف مثنوی گلزار نسیم مثنوی میر حسن کے جواب میں ہے مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر استاد کے کہنے سے اُنھوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور اب یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ

اور سنہ اشاعت ۱۲۶۱ھ ہے اُسوقت مصنف زندہ تھے اور اسکی اشاعت سے دفعتًا ان کی شہرت ہوگئی۔ اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ۔ برجستگی محاورات۔ نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اسکی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ مثنوی سحرالبیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جدا ہے۔ یہ مثنوی اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیاشنکر کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اُردو کے ایک مایۂ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں۔

**صبا** میر وزیر علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشو ونما ہوا۔ اُن کے چچا میر اشرف علی نے اُن کو بیٹا بنایا تھا اور اُنھوں ہی نے اُن کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور ملنسار اور بڑے یار باش آدمی تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور اُنکی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے۔ خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ اِن کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہوگیا ہے جسکا نام غنچۂ آرزو ہے۔ ایک مثنوی شکارنامۂ واجد علی شاہ بھی اُنکی یادگار ہے۔ اِن کے کلام میں تصنع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ کبھی کبھی کوئی

چوچلتا ہوا شعر اپنے اُستاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں۔

**آغا حجو شرف** میر سادات حسین خاں نام عرف آغا حجو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سمدھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولیعہد کے خسر تھے۔ غدر کے بعد اودھ کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج میں ولیعہد کے ہمراہ تھے اتفاق سے ولیعہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا طرز کلام وہی ہے جو لکھنؤ اسکول کے شعرا کا ہے یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں دلچسپ۔ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جہاں میں حسن پرستوں کی جان لینے کو ۔۔۔ نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوبرو کیا کیا
ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ ۔۔۔ چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
زباں جو اُن کی شرف نشہ میں بہکتی ہے ۔۔۔ مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا ۔۔۔ قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی ۔۔۔ پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

رما کے دھونی جو بیٹھا ہوں ہانگ پر اُٹھکی ۔۔۔ اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

**اس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے** تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں ایک مختصر فہرست اُن تغیرات کی دی ہے جو ناسخ اور آتش اور نیز اُنکے شاگردوں کے عہد میں نظم اُردو میں وقوع میں آئے وہ تغیرات یہ ہیں غیر مانوس اور موٹے موٹے فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دیے گئے تھے اُنکا پھر داخل شعر کیا جانا صرف اُن محاورات کا استعمال جو حسن شعر کو بڑھائیں لو ریعل لب معشوق کا خط و خال گل و بلبل قمری و سرو غیرہ کے رواج او دور از کار تشبیہات و استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی

# باب ۹

## دربار لکھنؤ اور اُس کے شعرا

## واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلی اُردو شاعری کا گہوارہ تھا۔ اسی طرح اُس کے زوال کے بعد لکھنؤ اُس کا مسکن و مامن بن گیا۔ اس وجہ سے کہ دلی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور میر و سودا و سوز وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرمانروایان اودھ کی داد و دہش اور جود و سخا کے افسانے سُن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہانِ اودھ نے بادشاہان دہلی کے تتبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کئے تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرمانروایان ذیل جنکا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

**آصف الدولہ آصف** نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعر و سخن کے بڑے قدردان و مُربی تھے جنکی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب یحییٰ خاں نام مرزا امانی عرف آصف تخلص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور جانشین تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے۔ تاریخ جلوس یہ ہے ؎

گشت از پائے آصف الدولہ ۔۔۔ رونقِ مسندِ وزارتِ ہند



نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ



واجد علی شاہ اختر

(اسمیں ہ کے تعمیہ سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عدو ہیں ۱۱۸۸ھ نکلتے ہیں)
جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو ابتک انکی یادگار موجود ہیں انکو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ اِن کے عہد میں انگریزوں کی آمد اودھ میں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا۔ کئی انگریز اجارہ داری نوکری وتجارت کے سلسلہ سے اودھ میں آئے۔ ریزیڈنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندووں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے راجہ بنی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے۔ مہاراجہ جھاؤلال۔ اور خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوے۔ شعر وشاعری اور جملہ علوم وفنون کے بڑے قدردان تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی اور صفائی ہے۔ اور تصنع اور تکلف جو ناسخ کے زمانہ میں وبال جان ہوگیا ان کے یہاں نہیں ہے۔ ایک اردو دیوان ان سے یادگار ہے جسمیں تقریباً ۲۴۰ صفحات میں غزلیں ۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے۔ انھیں کے مبارک عہد میں ملک الشعرا میرزا رفیع سودا اور خدائے سخن میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے اور انھیں کی سرکار دولتمدار کے مداح اور وظیفہ خوار رہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جہاں تیغ اُس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

گزرتے ہیں سو خیاں اپنے دل میں　　　کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف　　　تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

**نواب وزیر علی خاں متخلص بہ وزیر و وزیری**

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں انکے بیٹے وزیر علی مسند وزارت پر بیٹھے مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول کر دیا کہا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صلب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی۔ معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں اُنھوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی آخر کار جے پور میں جہاں کہ اُنھوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کئے گئے پھر وہ سرکاری حکم سے قلعۂ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں۔

جوں سبزۂ زندے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم　　　اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں　　　بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے　　　نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں　　　رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

**نواب سعادت علی خاں**

نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسند وزارت پر متمکن ہوے۔ اُن کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہدنامہ کیا گیا جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ اِن کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ سے نکل کر انگریزی علاقہ میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا

بادشاہ کو عیش و عشرت کے سوائے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی آصف الدولہ کے علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گوکہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ مصحفی اور انشا کے مشہور معرکے انھیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ سید انشا سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بیلی انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ۔

**غازی الدین حیدر** نواب سعادت علی خاں کے بعد اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند وزارت پر ۱۸۱۴ء میں جلوہ افروز ہوئے۔ اور پانچ برس بعد بعہد نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء میں انکی تخت نشینی ہوئی تو اسقدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ زر و جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر اُردو شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر اُن کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور مرثیہ کی صورت میں ہے اسقدر روکھا پھیکا اور بےمزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول اُن کے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے کہ "اُن کے اشعار اس درجہ خراب ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں"۔

**نصیر الدین حیدر** غازی الدین حیدر کے بعد اُن کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر بیٹھے ان کا زمانہ سلطنت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک ہے۔ مسند نشینی کی تاریخ ہی

جاودان سلطنت ہند مبارک باشد

جس سے بارہ سے تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمہ معصومین

کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی یہ غزل مشہور ہے۔

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے ۔ کہ ساقی لیے ساغر مشک بو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری ۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
جتاؤں میں کیا اپنا حالِ پریشاں ۔ عیاں زلف دلدار سے مو بمو ہے
چلو قبر فرہاد پر فاتحہ کو ۔ مگر آب شیریں سے لازم وضو ہے
شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر ۔ یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا ۔ نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوند عالم نگہبان تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد اُنکے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۴۲ء اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۷ء) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم و فنون کے مربی اور شعر و سخن کے قدردان تھے۔ اور اُن کے زمانہ میں بھی شعرا انعام و اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے۔ ان کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا۔ جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختر ۔ یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے۔ بعد وفات امجد علی شاہ اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بعمر ۲۰ سال ۱۸۴۷ء میں سریرآرائے سلطنت ہوئے ۔ مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج ۱۲۶۳ تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بیحد شوق تھا تخت نشین ہوتے ہی

تعمیر قیصر باغ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس کو عمارات وایوان دلکشا۔ بارہ دری۔ نہر۔ وپُل سنگ مرمر و تصاویر سنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپیہ اس عمارت میں صرف ہوا۔ یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جسکے تکلفات اور شان وشوکت بڈھے لوگونکی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں سلطان عالم کو شروع میں چند روز انتظام مملکت کا شوق اور عدالت ورعایا پروری کا ذوق رہا مگر نالائق مصاحبوں اور بد خواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش وعشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص وسرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا مثنوی غزالہ وماہ پیکر کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں جو محفل شاہی کو اپنے پراثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں۔ غرضکہ اسی عیش وعشرت اور ناچ رنگ کی بدولت ملک میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی جسکی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمایش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخرکار ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاع سلطنت کا حکم سُنایا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر یہ عظیم الشان ملک جسکی آمدنی دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہو گیا۔ سلطان عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیجدیے گئے اور یہ شعر کہتے ہوے کلکتہ چلے گئے ؎

دَر و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعۂ فورٹ ولیم میں نظربند کیے جانے کے بعد محلہ مٹیا برج میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فن تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی انھوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پُرفضا باغات بنوانا شروع کیے اور تھوڑے ہی

عرصہ میں مٹیا برج لکھنو کا ایک مختصر نمونہ بن گیا۔ سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اُس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی میں جس کا نام "حُزنِ اختری" ہے۔ قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا۔ مگر ہر بات میں نفاست اور جدت طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ اُن کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ فن موسیقی اور علی الخصوص ناچنے اور بتانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسی طرح شعر و سخن کے بھی بیحد دلدادہ تھے۔ اور بڑے بڑے کامل اُستاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو انھیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ اُردو کے ٹھیٹ ہندی میں بھی اُن کا کلام موجود ہے اور اُن کی بنائی ہوئی ٹھمریاں، دادرے وغیرہ جسمیں وہ "جان عالم پیا" تخلص کرتے تھے اب تک لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۸۷ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔

**تصانیف** ان کی متعدد تصانیف اسوقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جسمیں قصائد غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) - چھ دیوان بہ تفصیل ذیل۔ شیوع فیض۔ ثمر مضمون۔ سخن اشرف۔ گلدستۂ عاشقاں۔ ماہ ملک۔ نظم ناموَر

(۲) مثنویاں۔ حُزنِ اختری (جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ خطابات محلات

اس میں اُن محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا - اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا - یہ مثنوی اُس وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے - بنی - ناجو - دلھن - مثنوی درفن موسیقی - دریائے تعشق -

(۳) مراثی - جنکی تین جلدیں ہیں - ایک موسوم بہ جلد مراثی جسمیں ۲۵ مرثیہ یا دو ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں - دفتر غم و بحر الم - اسمیں بائیس مرثیہ ہیں - ارشاد ایمان اسمیں ۳۳ مرثیہ ہیں -

(۴) قصائد اُردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین النفس والعقل -

(۶) صحیفۂ سلطانی - اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرآنی ہیں -

(۷) نصائح اختری -

(۸) عشق نامہ

(۹) رسالہ ایمان دربیان مصائب اہل بیت

(۱۰) دفتر پریشاں -

(۱۱) مقتل معتبر

(۱۲) دستور واجدی درسیاست مدن

(۱۳) صوت المبارک

(۱۴) ہیبت حیدری

(۱۵) جوہر عروض (۱۶) ارشاد خاقانی - یہ آخری دو کتابیں علم عروض میں ہیں

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہو گی۔ اصلاح سخن میر مظفر علی آسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے۔ برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کا اُن کے حسب حال ہوا۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے ۔۔۔ جان دی آپ کے دروازے پہ مر کر اُٹھے

آسیر برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے۔ یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ آسیر اور برق کے اس عہد کے مشہور شاعر۔ امانت۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ ہلال۔ سرور تھے جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے۔ صاحبزادوں میں نواب ولیعہد بہادر کوکب اور نواب برجیس قدر بہادر برجیس تخلص کرتے تھے۔

**طرز کلام** طرز کلام وہی ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ کے شعرا کا عام رنگ تھا۔ رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ اُن کی مثنوی حُزن اختری جس میں مصائب سفر کا بیان ہے نہایت دلکش اور پُر تاثیر نظم ہے اسکی سلاست اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو اُنھوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکلیل محل یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفّے اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علیخاں توقیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط

بترتیب سنہ جمع کئے گئے ہیں اور ۱۲۷۰ھ میں شائع کئے گئے۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا دردانگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لیے جمع کیے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر تسکین ہو۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا　　آہ دلِ ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

گل رخ ہو کا۔ دہن عقد۔ غزال آنکھیں پری چہرہ　　شکم مہر۔ بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زباں عیسی

برائے سیر مجھ سا رند میخانہ میں گر آئے　　گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا۔ ہنسے ساقی بہے دریا

---

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں　　لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

---

یہ تمنا نہ رہے زیست میں لے بار خدا　　پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت

ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا　　یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت

وسعتِ خلد سے بڑھکر ہے کہیں حُبِّ وطن　　تنگئ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہان جہاں پر ہی پڑا وقت مگر　　ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

**اسیر** سید مظفر علیخاں متخلص بہ اسیر خلف سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصحفی سے اصلاح سخن لیتے تھے نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا۔ اسکے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے

معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظور کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوے جس کا ذکر جابجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب یوسف علیخاں والی رامپور۔ اور پھر اُن کے صاحبزادے نواب کلب علیخاں نے انکی اور ان کے کلام کی بڑی قدردانی کی۔ پھر مدت العمر اسی ریاست کے دعاگو رہے اور چھ ماہ رامپور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق سنہ ۱۸۹۱ء میں بعمر ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوے۔ بہت مشاق اور پرگو شاعر تھے انکی تصانیف میں چھ دیوان اُردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی اور ایک مثنوی "درۃ التاج" اور رسالۂ عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں۔ علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے۔ زبان پر انکی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ کے اہل لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علٰحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ انکے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و افضل اور نیز شوق اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست | مشکل کے وقت ایک ہی پروردگار دوست |
| کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار | دشمن ہیں لاکھ بار ہوے لاکھ بار دوست |
| ضد سے جتنا ہی یہاں کا فرو دیندار میں فرق | زاہدا اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق |
| زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے | ہر فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک |

روشن اُسی کا نام رہے ہے جو جلائے دِل　　آیا ہے ہمکو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے

**امانت** سید آغا حسن خلف میر آغا رضوی لکھنوی روضۂ مشہد مقدس کے کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو اُس زمانہ کے مرثیہ گویوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انھوں نے بھی اصلاح لینا ترک کر دی۔ ۱۲۵۰ھ میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہوگئے مجبورًا بذریعۂ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت ۱۲۶۰ھ تک رہی آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کربلا جاکر زبان خود بخود کھُل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معما اور چیستان کہنے کا بہت شوق تھا۔ انکی تصانیف سے دیوان خزائن الفصاحت۔ گلدستۂ امانت۔ اندر سبھا اور اکثر مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اندر سبھا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے لطافت اور فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعرائے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے۔ اِن کا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اسقدر شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ کے سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور

بناوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا — شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو
فی سبیل اللہ پانی اِن کو دو اے آبلو — کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبانِ خار کے

برعکس اسکے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

آنسو رواں ہیں زلف سیہ کے خیال میں — موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں
عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں — زخم کیصورت ہے خون آنکھوں سے جاری اندنوں
فصل گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو — ساقی مہوش ہو۔ مَے ہو شیشہ ہو۔ پیمانہ ہو
کوچۂ قاتل تلک لے دل رسائی کیجئے — کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق — خواجہ ارشد علیخاں عرف خواجہ اسداللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد بتاتے تھے۔ جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور ہے۔ ان کے کلام میں محض لفظی تصنعات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال و رکاکت بھی پائی جاتی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے انکا کلام بہت مستند اور قابل قدر ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے معرا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی طلسم الفت نہایت دلچسپ اور قابل قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ مظہر عشق کے شروع میں چند قصیدے واجد علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک مخمس بھی ان کی تصنیف سے ہے جسمیں بادشاہ کی نظر بندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حُبِّ وطن اور بادشاہ کی محبّت کے خیال سے۔

ذکی | مہدی علیخاں متخلص بہ ذکی شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں مُراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جسکے صلہ میں انعام واکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں اُنکی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ دکن سے لَوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے اُن کو ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا۔ بعد انتزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر نواب یوسف علیخاں والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۳۰۱ھ میں انتقال کیا۔ علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا مشاق اور خوشگو شاعر تھے۔ اور دوسرے درجہ کے شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے تھے

درخشاں | سید علیخاں مخاطب بہ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ کا تخلص ہے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش سے دربار رس ہو گئے تھے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر | قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آرہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا آخر مرزا قتیل کے شاگرد ہو گئے

ور مصحفی جرأت اور انشا وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ چندون فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے اِن کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اسکے صلے میں بہت کچھ انعام واکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے جسکی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاوہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں ۱۲۸۰ء میں انتقال کیا[۱]۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں "محامد حیدریہ" غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔ "گلدستہ محبت" جس میں گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔ مثنوی سراپا سوز، صبح صادق، جو اپنی سوانحمری آپ ہی لکھی ہے۔ تذکرہ آفتاب عالمتاب، جسمیں پانچہزار فارسی شعرا کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔ دیوان فارسی، بہار بیخزاں، بہار اقبال، ہفت اختر، دا ایک دیوان ریختہ،

یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونۂ کلام پیش کیجاتی ہے:۔

جب پردہ رُخ سے دور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہد عصر سا قیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا

کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بطنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا

میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجیے جو آپ مجکو نہ مورد عتاب کا

تقوے ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اِس اجتناب کا

---

[۱] تذکرہ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں وفات پائی۔

مے ہو وے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش — اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیحجاب — دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ مُنہ سے مُنہ — یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے — گر پی نہ جاے جلد یہ پیالہ شراب کا

اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا



# باب نمبر ۱

## مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف

مرثیہ وہ صنفِ نظم ہے جسمیں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے اہل اسلام اس کے بہت شایق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے کیونکہ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کیجاتی ہے اصطلاح میں مرثیہ انھیں نظموں کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیہ کے ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی اُن میں ممدوح کی صفات حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اسکی موت پر اظہار افسوس کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مرثیے بہت مختصر ہوتے اور اُنکی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اسمیں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے مثلاً چہرہ، ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ سامان حرب و ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

**مرثیہ کی قدامت** عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہو گئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لیے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی۔ کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسقدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اُتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف، آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لیے اُسکی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ اور وہ انواع سخن جنکو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے دفعتًا پستی کی حالت میں آگئے۔ ہر چند کہ قدما کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلًا شاہنامہ میں مادر سُہراب کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے سُہراب کی موت پر یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بعینہ ہوں آجکل کے خیال کے مطابق بہ مشکل مرثیہ کہے جا سکتے ہیں۔ اسکے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوے۔ اور نہ لوگوں کو اِن کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محتشم کاشی گو کہ بےمثل مرثیہ نگار تھے۔ مگر اُنھوں نے بھی طرزِ قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب آملی۔ غزالی۔ میلی۔ کلیم وغیرہ نے گو کہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے۔ مگر اُنکے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اُردو مرثیہ کی ابتدا

جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی اور اسکی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجا پور نہ صرف شاعروں کے قدردان تھے۔ بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونیکی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اُس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا ولی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں اُن کو مرثیہ سمجھیے یا کچھ اور[1]۔ اسکے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت شائق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھکر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لئے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے مثلاً میر امانی۔ میر عاصمی۔ میر آل علی۔ درخشاں۔ سکندر۔ صبر۔ قادر۔ گمان۔ ندیم وغیرہ اسیطرح میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ اُن میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لیے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے اجداد میں تھے۔ سودا کے وقت تک عموماً مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اب تک مروج ہے۔ اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اسمیں جدید تشبیہات و استعارات معرکہ کارزار کے مفصل حالات۔ شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کیے جو انیس

[1] تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲۔

و دبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہونچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زورِ بندش میں
چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

**بزرگان انیس اور اُنکی خدمات مرثیے کے ساتھ**

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر امانی۔ اور میر ضاحک اور میر حسن نے
مرثیے کہے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے
جسمیں سے تین یعنی خلیق اور خُلق اور محسن شاعر تھے۔ خُلق اپنے والد ہی کے شاگرد
تھے صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں اُنھوں نے
انتقال کیا۔ خلیق بھی بجاے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ
ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔

**خلیق**

میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے
فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی
اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیف مثنوی
سحر البیان فرصت نہ تھی لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا۔ تھوڑے دنوں میں
یہ مشاق ہو گئے اور کلام اسقدر بامزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے
یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے
ور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لئے جائینگے۔ جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل
ڑھی۔ جس کا مطلع تھا۔

نک آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو  صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

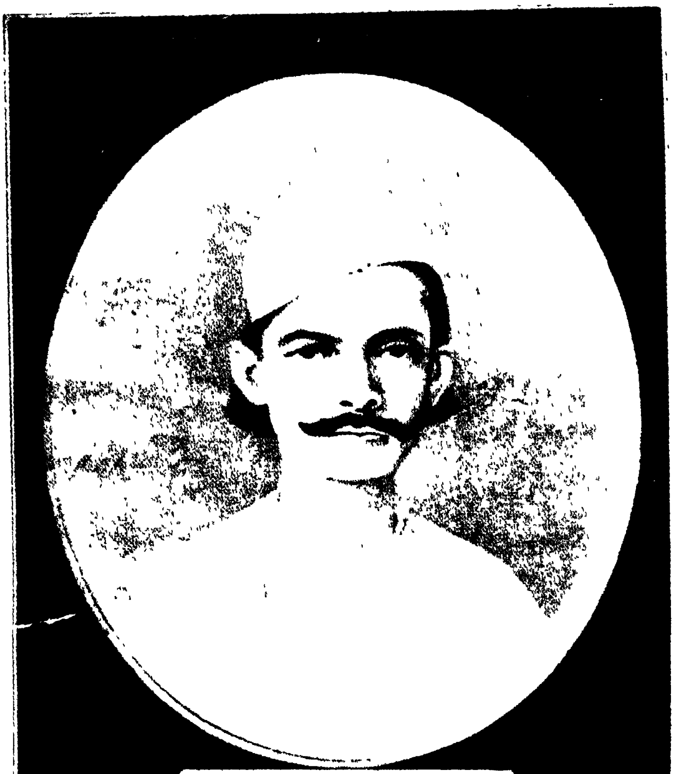
آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر
میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو

عیال کا بوجھ سر پر پڑا۔ چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا اغزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میر خلیق ایک پرگو شاعر تھے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت تھی اس لیے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علیحدہ کر کے اُسمیں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح شاگرد ناسخ و دلگیر اج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہگیا تھا۔ لہذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کیلئے کاوشیں کرتے تھے جسکا نتیجہ مرثیے کی تکمیل و ترقی کیواسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجاے چومصرعہ کے اب مسدس کا رواج ہوا۔ اسکی ابتدا سودا سے ہوئی تھی اور خلیق نے اسکو پھیلایا۔ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجاے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کہی جاتی وہ نوحہ کہلاتی اور اُسکو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تمہید پھر سراپا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیے محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رُلانے کیواسطے ایک مقررہ طریقہ پر کہے جاتے تھے اب اُسمیں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جنکی جانچ پڑتال بھی ایسے کی جاتی تھی جس طرح اساتذۂ شعرا کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب

اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور اسکی بوسیدہ ہڈیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری کی ایک موقر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرقہ ہائے اسلام یہانتک کہ اہل ہنود بھی دلچسپی لیتے ہیں اور بہت ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درد واثر کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق انکے اور میر ضمیر کے یہاں مابہ الامتیاز ہے۔ انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ اسیطرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔ میر خلیق کا خاندان زبان اردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لیے مشہور ہے۔ چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

**میر انیس** میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم وتربیت پائی۔ لکھنؤ میں اسوقت آئے جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی انس ہمراہ تھے۔ ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب سے اور صدرا مفتی میر عباس صاحب سے

بڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور اُن کے بیٹے
میر امیر علی سے حاصل کیے جو اس فن میں اُس زمانہ کے اُستاد مانے جاتے تھے
فن شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فن سپہگری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ
دکھانے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ محسن تناسب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان
میں ہو یا کسی دوسری شے میں اُسکی دل سے قدر کرتے تھے۔ اُن کو اپنی عزت
خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خودداری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔
وضعدار بھی بہت بڑے تھے۔ ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے۔
ایک وقت معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتی کہ اُن کے گھر والے
بھی بغیر اطلاع اُن کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ امرا سے بہت کھنچکر ملتے تھے۔ یہانتک
کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اُسوقت تک نہیں گئے جبتک کہ ایک معتمد شاہی
اُن کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے
تھے آئین وضعداری کے بہت سختی سے پابند تھے جسکو انھوں نے اپنے اور اپنے
احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کرلیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا
جسکو اُنھوں نے عمر بھر نباہا۔ لوگ جس طرح اُن کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح
اُنکی پابندی وضع کے بھی قدردان اور مداح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک
رئیس حیدرآباد نے میر صاحب کی جوتیاں اُٹھا کر اُنکی پالکی میں رکھدیں اور اس پر
اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ یہ اُن کے مزاج کی خودداری، قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا
کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا روپیہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا
البتہ امراے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مداح آل رسول سمجھ کر پیش کرتے تھے اُس کو



شبیہ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ



میر مونسؔ لکھنوی

قبول بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تا انتزاع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے جب کبھی باہر جانیکا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اسکی قدر کیا کریگا اور ہماری زبان کا لطف کیا اُٹھائے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علیخاں کی طلب اور اصرار سے پٹنہ عظیم آباد تشریف لیگئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے تھے۔ اِس کے بعد ۱۸۷۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوئے الٰہ آباد میں قیام کیا۔ اور ان سب مقامات پر اپنے معرکتہ الآرا مرثیوں سے لوگوںکو مستفیض اور داخل حسنات کیا۔ جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہوجاتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پہروں کے بھی چپہ بھر زمین سننے والوں سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا ہے جو قدردانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضۂ بخار ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا[۱]۔ اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوے۔

**میر انیس بحیثیت شاعر** میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعراء کا نہیں پیش کرسکتا۔

---

[۱] کسی نے کیا خوب مادۂ تاریخ نکالا ہے جسمیں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو سے مرزا دبیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے ع

غم انیس میں ہے ہے ۔ دیا دبیر کا غم
۱۲۹۱ ۱۲۹۲

لہذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جبکہ فیض آباد میں قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزین تخلص کرتے تھے شاید اس مناسبت سے کہ اُن کے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی حزیں میں بہت ربط و ضبط[1] تھا۔ جب لکھنؤ آئے تو اُن کے والد اُن کو ناسخ کے پاس لیگئے ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ انکی شہرت ان کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیق اور ضمیر میدان مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو دبیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراجِ کمال تک پہونچا دیا۔

**تصانیف** میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا مگر جسقدر چھپ چکا ہے پانچ جلدوں میں ہے۔ ما بقی اُن کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ جس طرح اُن کا کلام لاجواب ہے اسی طرح اُن کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا اُن کی آواز، قد و قامت، صورت۔ غرض ہر شے اس کام کے لئے موزون واقع ہوئی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھکر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی

[1] یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحک میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی حزیں خان آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور اُن سے سن میں بڑے تھے لہذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحک نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ارتباط وغیرہ تفاوت سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے ۱۲

مشق کرتے تھے۔ میر انیسؔ کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب ویابس کا مجموعہ نہیں ہے۔ ادب اردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے اُن کی جگہ صفِ اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اُردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور اُنکو ہندوستان کا شیکسپیئر۔ اور خدائے سخن اور نظم اُردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

**انیس کی خدمت زبان کے ساتھ**

انیس نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اُسکو خوب صاف کیا اور مانجا اور اُن کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لئے مشہور عالم ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی پر اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ لغات کی معلومات انکی بہت وسیع تھی۔ اور الفاظ کی سجاوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے انکی وجہ سے داخل زبان ہوے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی اُنھوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا اُسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے اُن کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اسطرح کہ جیسے آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جسمیں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں

اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا۔ میر صاحب کا مرتبہ زبان اُردو میں بہت خاص ہے اسوجہ سے جو احسان اُنھوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اُردو باوجود اصناف نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے ابتک تہیدست تھی اُس میں ہومر کی الیاڈ۔ ورجل کی انیاڈ۔ ویاس کی مہابھارت۔ والمیک کی رامائن۔ یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی تصنیف موجود نہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ زبان اُردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لیے ایک مدت مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ انیس کے مشہور مراثی سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندرنامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انھوں نے دکھائے ہیں اُس کا بھی جواب زبان اُردو میں کہیں نہیں ملتا۔

**مرقع نگاری** انیس کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرثیہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جسمیں صدہا خوبصورت خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اُسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں مثلاً

صبح کا سماں۔ طلوع آفتاب۔ نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے۔ شام کا سہانا وقت، چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیانک منظر۔ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا۔ سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جزو ضروری ہیں۔

اظہار جذبات

مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات۔ خوشی و غم۔ غصہ۔ محبت۔ رشک وحسد۔ بیم و رجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر۔ جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے اُنکی اصول ڈراما نویسی کی کما حقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ اسیطرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجۂ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی۔ حریف کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں۔ سامان حرب و ضرب علی قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کیگئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ و تخییل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مؤرخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ

من وعن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوے۔ اُن کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل میں ہے مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعرا اپنے ماقبل کے شعرا کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبد الغفور صاحب نساخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جسمیں اُنھوں نے انیس اور دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اسکے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو واقعیت بین بین میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ اُن میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ اُن لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنھوں نے مرثیے پڑھے۔ کہیں کہیں پُرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہوگئے۔ مگر اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوے ضرور ہیں۔ مگر تعجب کی کیا بات ہے اسوجہ سے کہ اُنھوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوگئیں تو اُس سے اُن کی اُستادی پر کیا حرف آتا ہے۔

**میر انیس کا طرز**

میر انیس تمثیلوں۔ استعاروں، اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جنکی اُس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حُسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اُنکی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ اُن سے ایک عجب دلکش اثر

پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں اُن کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنی قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت، نشست الفاظ۔ اور زور یہ سب اُنکی کلام میں ملے ہوئے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اُس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جسکو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اُسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیس کا مرتبہ اُردو شعرا کی صف اولین میں نہایت اعلی و ارفع ہے۔ اُنکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا انکی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اسکی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔ انیس نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جسکا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جسکا دماغ معمولی شعر و شاعری کی عطر بیزی سے بعض وقت پریشان ہو کر حقیقی شاعری کی نکہت کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ اُنکی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اُسوقت تک ترقی کرتی جائیگی جبتک زبان اُردو ترقی کریگی۔

بلکہ اُسی وقت انیس کی واقعی قدر کیجائیگی ۔

دبیر — مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کیگئی ہے کہ ان کو عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا دبیر ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے بزرگ قدیم زمانے میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے۔ ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کرکے رہ پڑے اُس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہوگیا تو پھر دہلی واپس گئے۔ مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اُس وقت آئے جب اُن کی عمر تقریباً سات برس کی تھی ۔ مرزا استعداد علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شائق تھے جس سے اُن کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر گوے سبقت لے گئے ۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سُرور نے فسانہ عجائب میں اُس وقت کے مشہور مرثیہ گویان لکھنؤ میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے ۔ مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ ان کو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا۔ لکھا ہے کہ اکثر رؤسائے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی اُن کی شاگرد ہوگئی تھیں اور اب یہ زبان اُردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے ۔ اُن کی شہرت سے اور نیز اُستاد کی عزت و محبت

برتاؤ سے بعض لوگ آتش رشک وحسد سے جلنے لگے اور اُستاد وشاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیر نے نواب افتخار الدولہ[1] کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا، رنجش اور بددلی پیدا کرا دی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملے نے طول نہیں کھینچا اور مصحفی و انشا کی طرح تھکا فضیحتی کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب واحترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع اُنکو برا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہوچکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہونچے۔ اب میر ضمیر بوڑھے ہوگئے تھے مقابلہ آئندہ مرزا دبیر اور میر انیس میں شروع ہوا۔ یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب وآداب کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ بحکم واجد علی شاہ جو اسوقت مٹیا برج میں قیام گزیں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے اُن کا علاج کیا۔ مثل میر انیس کے یہ بھی غدر ۱۸۵۷ء تک گھر سے نہیں نکلے تھے مگر ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے اور سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں اس دار ناپائدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

**دبیر بحیثیت مرثیہ گو** مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے اُستاد کامل تھے۔ اُنھوں نے اپنی پوری عمر اسی شغلہ میں صرف کی۔ اِن میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور

[1] آب حیات میں لکھا ہے کہ یہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی ۱۲

شکوہ الفاظ اُس پر طرہ ہے۔ مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلےٰ تخیل، نئی تشبیہات، اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں۔ اسمیں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات اُن کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ اُن کے کلام میں ایک عالم فاضل کی جھلک برابر آتی ہے۔ وہ آیات قرآنی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُرگو اور زود گو تھے۔ اُن کی کثرت خیالات حیرت انگیز ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے، اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پُرشکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے، اپنی زودگوئی اور پرگوئی سے، اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعرا کی صف اولین میں اُن کو جگہ دی جائے۔

**انیس اور دبیر کا مقابلہ**

اِن دونوں کے مقابلے سے اہل لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہو گئے ایک طرفداران انیس دوسرے جانب داران دبیر جو باصطلاح اہل لکھنؤ انیسیئے اور دبیریئے کہلاتے تھے ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ کے سخیف اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہونچ جاتی تھی مگر ایک مورخ کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان حزبی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور اُستادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہانتک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا دونوں ایک ہی صنف نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوانح

اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثی و رباعیات و سلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اُردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاذ تھے۔ اب فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری اُن کو ورثے میں ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

مگر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جُدا جُدا ہے۔ انیس کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چُستی اور محاورے کی درستی پر ہے۔ برخلاف اسکے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند تخئیل، نئی نئی تمثیلیں اور پرشکوہ الفاظ زیور کلام ہیں مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایۂ ناز ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہوں سے پاک و صاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو جیساکہ بیان کیا جاتا ہے، کہ مرزا صاحب کو عربی درسیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اسقدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔ اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہوگئی ہے کہ دبیر کے کلام کو کم کرکے دکھایا جائے اور اُن کا مرتبہ انیس سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیر بھی

مثل انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر مینائی اور اسیر لکھنوی نے اعتراف کیا ہے۔ اُن کی شہرت خود اُن کے زمانہ میں بھی بہت تھی جیسا کہ لفظ "استاد" سے ثابت ہے جو اُن کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

**مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب**

لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے جہاں ایام عزا میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہدائے کربلا کی مجالس نہایت سیر چشمی اور تکلف سے کرتے ہیں، امیر سے غریب تک اس مہینہ کو متبرک سمجھکر جملہ مراسم عزاداری اسمیں انجام دیتے ہیں۔ اظہار غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ کوئی شخص یہانتک کہ بڑے سے بڑا مشکک بھی علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر شیعہ شخص اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیرؑ کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہدے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگونکی قدردانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ اُن کو بامذہب خیال کریں۔ درحالیکہ وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگی۔ مگر علما اور شعرا مرثیہ کی قدر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔ وہ اُس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے بہر طور جو کچھ وجہ بھی ہو

وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے

میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ رزمیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ معہ تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا ترک، جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے، غرض کہ یہ اور اسی قسم کی بہت سی جدتوں کا سہرا میر ضمیر کے سر ہے مگر انیس و دبیر نے انھیں چیزوں کو ترقی کی معراج تک پہنچایا اور اُن میں چار چاند لگائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن بزرگوں نے اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا اور اسی زمانے سے مسدس جس میں عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں پُرجوش نیچرل نظموں کے لئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا "مدو جزر اسلام" حالی کا مشہور مسدس اسی عنوان پر ہے۔ سُرور جہاں آبادی نے بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلۂ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھیے تو آزاد، حالی، اور سرور وغیرہ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین اور رہین منت ہیں کیونکہ زمانۂ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو مرثیہ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست زبان، تشبیہات، تخیل وغیرہ، جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے اُستاد اب سے بہت پیشتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی نمود اور اُسکی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں

ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اُس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات
وبرانگیختہ کرتی ہے۔ اُس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیائے شاعری
عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنےٰ اور رکیک جذبات کی
دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفریں ہے۔ ہرچند کوئی مرثیہ بلحاظ فن
گرا ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اُس کے مُفید
ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ اُس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔
لہذا شاعر گو غزل میں وہ کیسا ہی پست اور لاابالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت
مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا، شجاعت
عالی ہمتی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں، جو ہم اس افسانۂ مصائب وغم میں
برابر سُنتے رہتے ہیں۔ ہماری درستی اخلاق کے لئے اور ہم میں شریف اور اعلےٰ
جذبات پیدا کرنے کے لئے ازبس مُفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہو بہو
نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں
کی پُر جوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کُفّار کا قتل وقمع، کمزوروں
کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اُردو
میں صنف "ایپک" (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جسکی اُس میں اب تک
کمی تھی۔ ہمارے اُردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دُنیا
کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی
خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیس اور دبیر
کہکے چھوڑ گئے اُن سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابل قدر اضافہ ہوا۔ پھر اُس

زمانہ سے اِس وقت تک کے استعمال نے اُن کو اور صاف کیا اور مانجا الحق مرثیہ نے محدود میدان اُردو کو وسیع کیا اور زبان اُردو کے سلاح خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا ۔

**دیگر مرثیہ نویس** اِس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیر اور فصیح تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اِن سے پیشتر میاں مسکین (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سوا اس کے کہ اُن کا نام میر عبداللہ تھا) افسردہ، سکندر، گدا وغیرہ ہیں۔ جن کے مرثیے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں ۔

**خاندان انیس** یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں پشتہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاءاللہ وہ سلسلہ جاری ہے مشغل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر امامی (جو میر امامی موسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ اِن کے بعد سلسلۂ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے :-

میر امامی
میر عزیز اللہ
میر ضاحک
میر حسن
خلق — خلیق — محسن
میر انیس — میر مونس — میر انس
نفیس — سلیس — میر عسکری رئیس — میر وحید
دولھا صاحب عروج — دختر — جلیس
عارف

اِس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

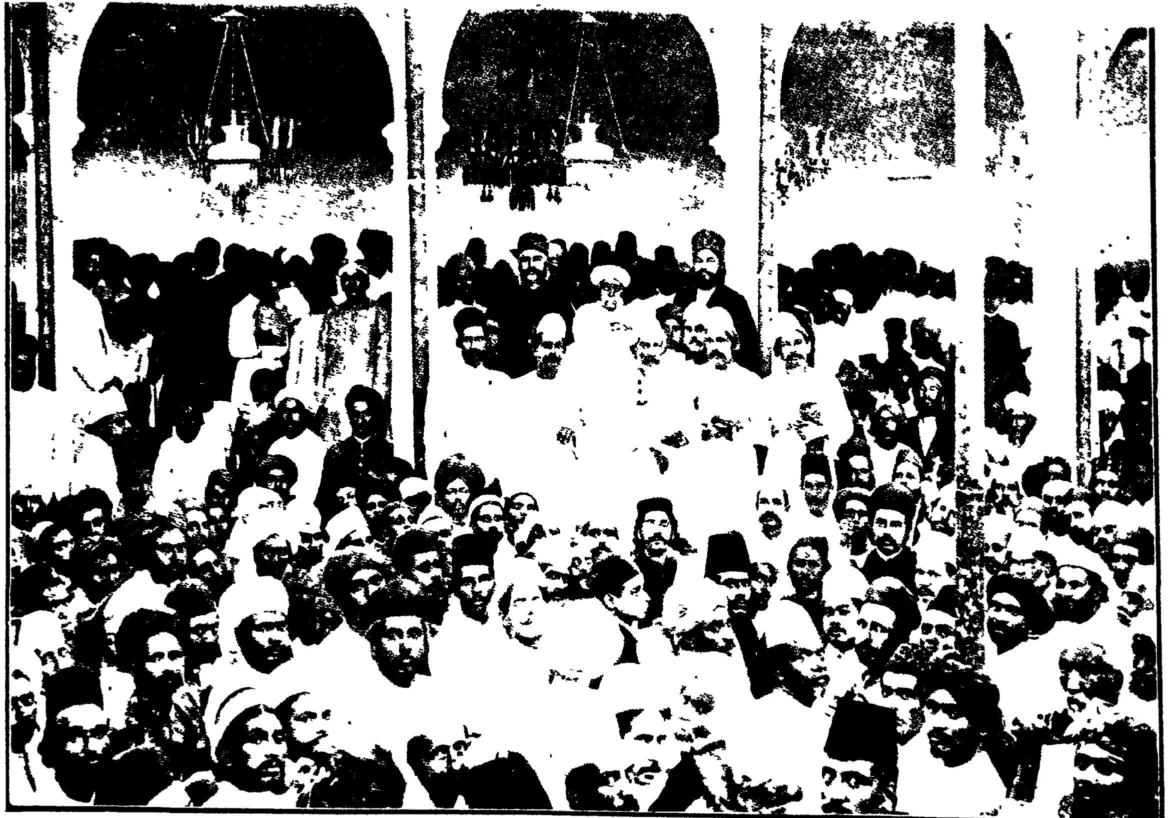
**میر مونس** میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت مؤثر اور دل کش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں اُن کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہرہ دیتے تھے۔ میر مونس کا انتقال سنہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

**میر نفیس** میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سلیس اور میر رئیس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے۔ لائق باپ کے لائق فرزند تھے اور انھیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ اِن سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی وسلام و رباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے۔ سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء میں بعمر پچاسی سال انتقال کیا۔

**عارف** سید علی محمد عارف سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد اُن کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے اُن کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زباں داں تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں ایک خاص درجۂ امتیاز اُن کو حاصل تھا۔ اُن کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے



مير علي محمد عارف



حیدرآباد میں میر نفیس لکھنوی کی ایک مجلس
میر نفیس وسط میں ہیں اور عارف اُنکے داہنی جانب ہیں

بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے ۱۳۲۲ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال کیا۔

جلیس | سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس میر سلیس کے صاحبزادے پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ ہونہار شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولھا صاحب عروج (میر نفیس کے صاحبزادے) اور فائق (عارف کے صاحبزادے) اور قدیم (سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کو مستفیض اور محظوظ کرتے ہیں۔

سید میرزا اُنس کا خاندان | یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

سید میرزا اُنس | سید محمد میرزا اُنس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر اب تک اُن کا کلام چھپا نہیں اور اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اُس زمانے کے بڑے بڑے شاعر مثل قلق، بحر، اسیر، میر کلّو عرش وغیرہ کے بلاناغہ اُن کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ نوابی میں سو روپیہ ماہوار ان کو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُنس نے نواب منورالدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں نواب کلب علی خاں والی رامپور نے اُنس کو طلب کیا اور اپنے استاد منشی امیر احمد صاحب مینائی کو اُنکے لینے کیواسطے

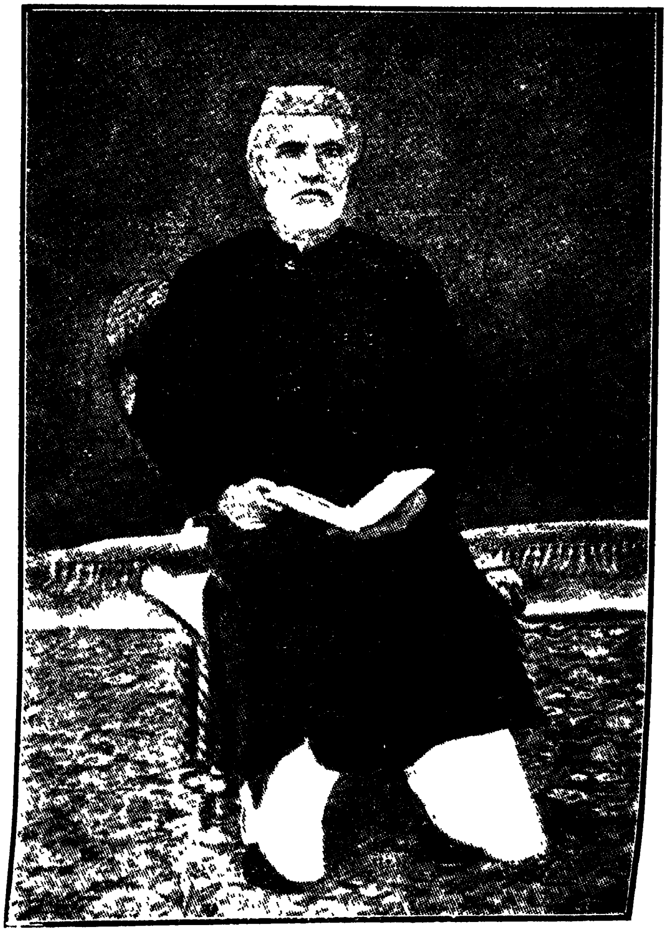
لکھنؤ بھیجا۔ اُنس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں سنہ ۱۳۰۲ھ میں بعمر ۹۵ سال قضا کی۔ چونکہ اُن کا کلام چھپا نہیں لہذا اِس کے متعلق کوئی رائے نہیں ظاہر کی جا سکتی۔ صرف اِتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ اِن کے پانچ بیٹے تھے۔ عِشق، تعشق، صبر، صابر اور عاشق۔

**عشق** حسین مرزا عشق، معروف بہ میر عشق، اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل اِنھیں اُستادوں کے مرثیہ کے اُستاد مانے جاتے ہیں اور اِن کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیئے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ اِن کے پوتے عسکری مرزا مُودّب جو اپنے چچا رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

**تعشق** سید میرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے اُستاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک عرصۂ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے اور اِن کا کلام جذبات، حُسن بندش، نزاکتِ خیال اور تاثیر کے لیے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو اِن کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور اِن کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور اِن کا مرتبہ اپنے زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔ میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور اُنھیں کی صحبت سے یہ برابر فیضیاب رہے۔ سنہ ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔



سید مرزا تعشق لکھنوی



ہمارے صاحب رشید

**احمد میرزا صابر** یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کیوجہ سے قابل ذکر ہیں۔ انکی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہو گیا۔ یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ اُن کو بہت مانتے تھے اور اُن کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کردیا تھا۔ جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے اُن کے جوابات اُسی طریقہ کی نظم میں اُنکی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۲۷ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

**پیارے صاحب رشید** سید مصطفےٰ میرزا معروف بہ پیارے صاحب المتخلص بہ رشید ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی اِن کی شادی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے عشق کے بعد اپنے دوسرے چچا تعشق سے مشورۂ سخن کیا اور سچ پوچھیے تو اُنھیں کا رنگ اُن کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غالب ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر بھی اور اس میں وہ اپنے اُستاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرثیے، غزلیں، سلام، رُباعیاں، بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ اُن کی غزلوں میں سلاست زبان، حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے مگر جدت خیال اور تاثیر کم ہے۔ اُن کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں۔ سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے، مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت

مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں - مرثیہ میں انھوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہار اضافہ کیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا - کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں - اِن سے پیشتر بھی اکثر اُستادان فن اِس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے اُن کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دیکر لکھا - سنہ ۱۸۹۴ء میں نواب رامپور نے رشید کو سُنا تھا - رشید پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں اُنکی بڑی قدر اور خاطر و مدارات ہوئی - نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدرآباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے اُن کا مرثیہ سُنا اور بہت پسند کیا - اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا رشید کا انتقال بعمر ۷۴ سال سنہ ۱۳۳۶ ہجری میں ہوا - اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں - سید باقر صاحب حمید (یہ اُن کے بھائی تھے اور سنہ ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا) مؤدب، پروفیسر ناصری، جلیس مرحوم اشہر (مؤلف حیات رشید) شدید، ناظم فرہاد وغیرہ -

پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے - اِن کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے -

**خاندان دبیر**
**مرزا اوج**

مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج اپنے والد کے مُتبع اور اُنھیں کے رنگ میں کہتے تھے - اِن کی بھی پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شُہرت تھی اور اِن سب مقامات سے اُن کی حسب لیاقت اُن کی خدمت کی جاتی تھی - مرزا اوج بھی مثل اپنے

پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباں داں اور عروض کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک رسالہ بھی اُنھوں نے اِس فن میں لکھا ہے۔ خسرو دکن نے اِن کو بھی سُنا ہے۔

**نعت** نعت اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اِسلام کی مدح میں اشعار کہے جائیں۔ بہت سے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔



# باب ۱۱

## نظیر اکبرآبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبرآبادی

اِن کا تعلق کسی خاص دَور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے لہٰذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی بعہد محمد شاہ ثانی تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میرو سودا اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اسوجہ سے انشا جرأت اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گذرے۔ اِن کا طرزِ کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانۂ حال کا معلوم ہوتا ہے متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جا سکتے۔ اِس وجہ سے کہ اِن کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور ان کے اور اُن کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کا قدیم طرز تو اِن میں چھو نہیں گیا ہے کیونکہ ان میں بنوٹ اور رنگینی جو طرز لکھنؤ کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دورِ جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالب، ذوق، اور مومن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اسوجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے

اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا اِن کو مثل اُنکے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیرؔ کا نام ولی محمد اور اُن کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیرؔ کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی۔ چونکہ اپنے باپ کی بارہ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے لہذا باپ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیرؔ اپنی ماں اور نانی کو لیکر آگرہ چلے گئے جہاں محلۂ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمٰن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم تھیں۔ نظیرؔ فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیرؔ کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ اُنھوں نے حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کردیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلمی کی نوکری کرلی تھی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آگئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عُمر میں مرض فالج میں مبتلا ہوگئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبرسنی کی حالت میں ۱۶۔ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال کیا جیسا کہ اُن کے ایک شاگرد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے[۱]۔ لائل صاحب ۱۸۳۲ء اُن کا سنہ وفات بتاتے ہیں

---

[۱] وہ مصرع تاریخ یہ ہے ع مخمس بے سروپا۔ بیت بے دِل۔ فرد بے سر شد ؂

خ + م + ب + ت + ر + د = ۱۲۴۶ھ
۶۰۰ ۴۰ ۲ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴

مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں۔

نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے تھے اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے اُنھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اُن کو گانے سے کسرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور با مذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصب اور خود بینی اُن کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے اور سب اُن سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے کہا جا سکتا ہے کہ جسقدر کلام میں اُن کے فواحش ہیں وہ اِسی دَور کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہونگے۔ اِس زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو مستثنےٰ کر کے اُن میں بمثل مرقعے اُس سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس وقت مِلتے جُلتے تھے مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گذشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا اُن کا کلام نہایت قابل قدر اور پُر اثر ہے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفعل جسقدر موجود ہے اُسکی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہ ہوگی اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظیر بحیثیت واعظ و ناصح

اگر نظیر کے کلام میں سے اُن کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو اُن کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل اور معائب سے بالکل پاک ہے۔ اُن کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں ہیں[1] جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادھو لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معرف ہیں اور دُنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم "موت پر" اور "بنجارہ نامہ" مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے اور اُن کو آگاہ کرتا ہے کہ دُنیا دارِ فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوّف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہٰذا اُن کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، اُن کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ "الوحدۃ فی الکثرۃ" کے

---

[1] مثلاً "زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا"۔ یا "بٹ مار اجل کا آ پہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا" وغیرہ ۱۲

دِل سے قائل اور ع "با مُسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور اُن کو اپنا مُرشد اور گرو سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازہ کے ساتھ ہزارہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اُس کو لے گئے۔ نظیر مثل گرو نانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترکِ ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال ورڈس ورتھ کا ہے جسکی سانٹ (غزل) "دُنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں ۔

**نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے**

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ اُن کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، جنگ جانوراں، ہرن کا بچہ، بُلبُلوں کی لڑائی وغیرہ اس قدر دلچسپ ہیں اور اسقدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچے اُن کی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تر بوز، ع "کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دُودھ کے چھوڑے"، ع "کیا دِن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے" ہولی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ کو [illegible] میں [illegible] کے تمام لطفوں اور حظوں سے خوب بہرہ اندوز

ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیریں کرتے تھے۔ انھیں سیر تماشوں میں اُن کا پائے تہذیب کبھی پھسل جاتا ہے اور وہ بے ٹکان اُڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکال لیتے ہیں اور بقول شکسپیر "پتھر سے وعظ سنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے ہیں" یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دُنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس مزے سے اور ایسے جوشِ مسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بچّوں کی طرح وہ خود اُن سب میں شریک ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کیے رہا نہیں جاتا۔ اُن کی معلومات غیر محدود، اُن کا خزانۂ لُغات غیر مختتم، اور اُن کی صفائی بیان دلکش ہے۔ اِن کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصّب اور ناروا داری نہ تھی بلکہ کثرین کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت خلط ملط رکھتے تھے اور اُن کے رسم و رواج، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کے تہوار اور معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اسقدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہم کو اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ کبھی تمسخر نہیں کرتے اور نہ اُن کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں، اسی سے اُنکے کلام میں ایک مقامی رنگ ہے جو اکثر ہمارے شعرائے اُردو میں کمیاب بلکہ نایاب ہے البتہ کہیں کہیں سودا، اور انشا کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے، کیونکہ اُن کے خیالات، اُن کی زبان اُن کے معانی

سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ۔

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابلِ قدر ہے۔ اُنھوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اُٹھایا جن کو شعرا ادنیٰ اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اِس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں اُن کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیرؔ نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جنکو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اسمیں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں تھے جو اُن کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں نظیرؔ کی مستعملہ لغات تین قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں :-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں ۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اُردو شاعری کے مایۂ بساط ہیں ۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حُسن شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانۂ زبان مالا مال ہو جاتا ہے۔

نظیرؔ پر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دِل خوش کیا کرتے تھے۔ اُن کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ جاتا ہے اور اُنھوں نے

اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت اُنکی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر میلے ٹھیلے وغیرہ جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور اُن کے بیان کے لئے اُن کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور اُن کی بول چال کو خود اُنھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ اُن میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اُن کا سچا فوٹو من وعن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجمعوں کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے اُن کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نیچرل ہوتا ہے تصنع اور بناوٹ اُن کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی حالی نے شاید اسی کثرت الفاظ کے خیال سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔ نظیر ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود اُن میں شریک ہو کر اُن سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُن کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اسیطرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک اُن کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور اُن لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں اُنسے سرزد ہوئی ہونگی —

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانہ موجودہ کی فطری اور قومی

شاعری جسکی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کہی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبرآبادی کہے جا سکتے ہیں جسطرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بمثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں اسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں، جنکی گنجائش شعر میں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں جس سے ان کا کلام عوام الناس میں بہت مقبول ہے۔ اِس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے اُن کے کلام میں کہیں نہیں۔ اُن کی تحریر سادہ اور بے تکلف، اور اُن کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر مجرد نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اُسی حالت میں کھینچتے ہیں جب اُن مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو اُنھوں نے منتخب کیا۔ اُن کی نظمیں برخلاف معمولی اُردو نظموں کے مُسلسل ہوتی ہیں۔ البتہ اُن کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں ہے۔ غرضکہ اپنے سادہ بیان سے، اپنے بے تکلف مگر پُر زور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے، اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور یکرنگی کا نام نہیں، نظیر اکبرآبادی ایک ایسے طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سرِ نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

**نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلہ انشا کے ساتھ**

نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے۔ اِس

رنگ کی ترقی کا باعث اُن کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور اُن کے شادی وغم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا اُن کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ اُنکی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس او رمصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور سطحی حوادث کو اپنے مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہدپن ہوتا ہے۔ نظیر اور انشا دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے اُستاد تھے۔ مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے۔ انشا کی ظرافت ایک ایسے درباری کی ظرافت ہے جو پُر مذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بعزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کردیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی بامذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشا کی ظرافت میں خوشامد اور بھٹی کی بو آتی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے۔ باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں ہمطرح بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں، دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوف کا سنہرا رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں

مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں آنشا مشاق ہیں - اور بمقابلہ نظیر کے اُن کے یہاں متروکات کم ہیں۔ اور اُن کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے -

**نظیر بحیثیت مصور کے**

چونکہ نظیر کو فن موسیقی سے بہت شوق تھا اِس لئے اُن کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مرقع نگار ہیں اُن کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شایق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جنکی آواز سے اظہار مطلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں۔ شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں انھیں کے مناسب سُریلے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دُور از کار تشبیہات اُن کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائع بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں اور آورد وغیرہ سے اُن کا کلام پاک ہے -

**اُردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے**

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اُردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہے اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہل عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے اُردو شعرا نے اسکو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سودا اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی، اپنی زبردست شخصیت، اپنی عام واقفیت اور قدرت زبان کی وجہ سے ضرور قابل لحاظ ہیں۔ اُنھوں نے بے مثل ہجویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہو سکتے تھے مگر اُن میں ٹریجڈی لکھنے کا مادہ، یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود ہے۔ میر کی حالت یہ ہو کہ سوز و گداز تو

[redacted]

اُن کے یہاں بدرجۂ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصناف سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اُنکی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشا کے یہاں تمسخر اور ظرافت کی بہتات ہے۔ اور وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کیوجہ سے خود ایکٹر بننے کے لیئے زیادہ موزوں تھے۔ مگر اُن کے درباری تعلق نے اُن کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی اُن میں بہت کم ہے۔ انیس و دبیر گو فطری شاعر تھے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے۔ مگر اُن کا دائرۂ عمل محدود ہے یعنی وہ محض مرثیہ نگار تھے۔ اور یہ تخصیص اُنکے واسطے قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیشن پلے (یعنی تعزیہ داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مریکل (معجزات) کے ڈراما اور مسٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے کیا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب تر ہیں اور یہی انیس و دبیر کے موضوع ہیں لیکن اُس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کیے ہوئے ہے معمولی معمولی کیفیات وجذبات انسانی نظر انداز ہوتے رہے نظیر کو بھی مثل سودا انشا اور انیس کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی، اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر شعرا سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان، بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام، دنیا دار اور تارک الدنیا سب سے ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا، عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اُسکے یہاں ایسے مرقعے جیسے شکسپیر کے یہاں ایموجن، ڈسڈیمونا، پورشیا، اور افیلیا، کے ہیں موجود نہیں ہیں جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں، اور اسی وجہ سے نظیر کو معزز عورتوں سے ملنے اور اُن کے

خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس کو صرف شاہدان بازاری کا تجربہ ہوا لہذا اُس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اُس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شیکسپیر کی طرح اُسکے خیالات میں عمق نہیں ہے۔ اور نہ شیکسپیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اُسکی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جاسکتیں۔ ایک "لیلیٰ مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "مہادیو کا بیاہ"، جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڈی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اُسکی نظمیں "ریچھ کا بچہ" اور "بلبلوں کی لڑائی" نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشا کی ظرافت، انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی جب غزل کی یکرنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اُکتا جاتا ہے تو نظیر کے اِس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اُس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کیئے اور ادب اُردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیت اشیا کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے بعض اوقات وہ فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اُسکی صاف بیانی سے تہذیب کے دِل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اُس کے کلام میں بعض جگہ متروکات

و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر باایں ہمہ وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اُس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے، اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت؛ اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اُس کو شعرائے اُردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

**شاہ نصیر دہلوی متوفی ۱۲۵۴ھ؍۱۸۳۸ء**

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبر آبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقۂ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اِس لیے اِن کو دور متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نصیر الدین نام نصیر تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کلو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے، باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بسر اوقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ شاعری کی طرف اُن کا رجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر کو سودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں اُن کی قدردانی خوب ہوتی تھی اور انعام واکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔ شاہ نصیر نے

سفر بہت کیے اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔علی الخصوص لکھنؤ اور حیدرآباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعرا جمع ہوتے تھے۔ایسے ہی مجمعوں میں اُن کے شاگرد ذوق کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دلی میں تباہی آئی اور شعرا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔تو شاہ نصیر بھی ہر اول ڈھونڈھنے باہر نِکلے۔ دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہونچے تو مُصحفی، اَنشاء، اور جُراَت کا زمانہ تھا جن سے خوب خوب مقابلے رہے[1] دوسری مرتبہ ناسخ اور آتش کا آوازہ سخن بلند ہو رہا تھا۔ناسخ سے بھی اِنسے مقابلے ہوے اور یہ کامیاب[2] ہوئے۔حیدرآباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چندولال جو شاداں تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعرائے دہلی کے بڑے قدردان تھے انکی داد و دہش کا شہرہ سُن کر یہ وہاں پہونچے۔مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی حیدرآباد بُلا بھیجا تھا مگر اُنھوں نے اِنکار کیا۔شاہ نصیر نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لیے اور اُن کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں وہیں انتقال کیا[3]

تصانیف | شاہ نصیر ایک پُرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلۂ شعر میں مُنہمک رہے

---

[1] دیکھو "بدن سُرخ ترا" "چمن سرخ ترا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل اُن کے حالات میں آبحیات میں ۱۲ [2] تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ابکی مرتبہ جیسی انکی قدر ہونا چاہیئے تھی نہیں ہوئی ۱۲ [3]۔قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوے۔ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (آبحیات ذکر شاہ نصیر) ۱۲

اس طویل مدت میں ایسے ذہین وذکی شخص نے جو اسقدر شاعری کا دلدادہ ہو گیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لیئے کہ اُن کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اُن کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جسمیں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض اصحاب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبدالرحمن خلف میر حسین تسکین شاگرد مومن نے کی تھی جسکا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رامپور نے اپنے کتبخانہ کے لئے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت متین و مہذب مگر اُس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے سیکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں چھوڑے حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے مایۂ ناز شاگرد ذوق سے چشمک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی اور وہ سودا و میر ایسے باکمالوں کی برابری کا دعوے کرنے لگے تھے۔

**اُن کا مرتبہ شاعری میں** شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں مثلاً۔

شب کو کیونکر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں
جوں پھوپیں ڈہالے مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

---

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

وقت نماز ہو اُن کا قامت گاہ خدنگ گاہ کماں     بنجاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ گاہ کماں

حال پشتِ لب شیریں ہے عسل کی مکھی     ولہ     روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

شکوہِ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ اِن کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ مثل صائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانہ کے اُستاد تھے اور صدہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

---

لہ مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ زنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! زنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپکی طرف سے بڑا تحفہ آپکا کلام ہے ان زنگتروں کی حسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے۔ اسیوقت رباعی کہی اور سنائی ؎

اے نیرِ برج آسمان اقبال     اِن زنگتروں پر غور سے کیجئے گا خیال

یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر     پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(آبحیات ذکر شاہ نصیر)

# باب ۱۲

## طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

## ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا از سر نو پھر عروج ہوا صفحات گذشتہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آگیا تھا۔ لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی اُن کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جسکو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدوکاوش سے سینچا تھا اب وہ نئے سرے سے پھپکنا شروع ہوا۔ دنیا میں مدوجزر، ترقی و تنزل، اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستاں نے پھر نغمہ سرائی شروع کی۔ اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنالیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دُنیا کے بہترین شعرا سے کیا جاسکتا ہے۔ ذوق و مومن گو کہ غالب کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفر بھی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغلِ حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے شعر کے شغل سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے

شعرائے دہلی جدید طرز لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباں داں اور شاعر تھے۔ ان حضرت کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر اُن کی جگہ فارسی الفاظ رکھدیے ہیں۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسیوقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبۂ فارسی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوئی جملوں کی ترکیبیں سہل ہوگئیں شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے مثال کے لیۓ حالی، سالک، ظہیر، انور اور مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیئے۔

| |
|---|
| مومن ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ |
| مطابق ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۱ء |

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جنکی اصل نجباے کشمیر سے تھی سلطنت مُغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو ان کی پنشن مقرر ہوگئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد اُن میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جو بات سُنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو ان کا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا

شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ اُن کے احکام (پیشین گوئیاں) سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ اُن کے بہت معتقد تھے اور اکثر آئندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی۔ اور دلی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو اُنھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشقبازی کے لیئے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا جہاں اُن کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زباں زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو اُنھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی اور نماز و روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ جو کلام اُن کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد ان سے صلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رام پور، سہسوان، جہانگیر آباد، اور سہارن پور کی سیر کی۔ چنانچہ کہتے ہیں سے

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق ‎ ‎ ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا ‎ ‎ ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بشاہرہ ۱۰۰ روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر اُنھوں نے

باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی باوجود بلشاہرہ تین سو پچاس نہ گئے۔ کیونکہ سُن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ اُن کو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر اُنھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلّی کی پُر لطف صحبتیں کہاں میسر ہونگی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربار داری اور خوشامد سے اُن کو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی اُن کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اُن کا دیوان اُمرا کے مدحیہ قصاید سے خالی ہے۔ سوائے اُس قصیدہ کے جسکا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری　　　کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا جنھوں نے اُن کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اسدرجہ خیال تھا کہ اُسکے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور اُن کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے۔ مگر اُنکی طبع رسا نے اُس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے۔ مثلاً اپنی صغیرسن بیٹی کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ خاک برفرق دولت دنیا ۔ من فشاندم خزانہ برسر خاک۔ آئیں "خزانہ" کے اعداد سر خاک یعنی (خ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں۔ ایک بیٹی کی

ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ہے

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے　　　کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے
اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے نکالی ہے

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے　　　فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادہ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

**تصانیف** تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اُردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُن کے مشہور شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مولف تذکرۂ شعرائے ہند نے اُس کو شائع کیا

**رنگ کلام** مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے اُن کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں انمیں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُن کو طرز لکھنؤ سے علحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں۔ اُنکی علمی لیاقت اور طباعی اُن کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُن کو بھی وہی تبحر حاصل تھا بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو

سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ انکی مثنویاں سر تا سر نشتر ہیں جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ اُن میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ہے اس معنی میں وہ طلسم اُلفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں مثالاً چند شعر درج ہیں -

روز جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا ـــ میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول ـــ گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف ـــ خون فرہاد سر گردنِ فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو ـــ کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینۂ زنگ غم سے توڑا ـــ کیونکر اُسے مُنہ دکھائیں گے ہم

**مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر** مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ اُن کے معاصرین انکی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام برآوردہ لوگ ہیں۔ مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحبِ دیوان و تذکرۂ گلشن بیخار۔ میر حسین تسکین۔ میر غلام علی وحشت۔ اصغر علیخاں نسیم وغیرہ۔ مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ اُنھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دِن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مر جاؤں گا چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے

کرنے کی تاریخ خود کہی تھی - دست و بازو بہ شکست - چونکہ اسی سال انتقال ہوگیا تھا لہذا یہی تاریخ اُن کے مرنے کی سمجھنا چاہیئے -

| |
|---|
| شیفتہ ۱۲۲۱ھ<br>لغایت ۱۲۸۶ھ |

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضےٰ خاں جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے اور اُس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا - علاقۂ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفےٰ خاں صاحب نے خرید کیا جو اب تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہے - نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ئ میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ئ تک وہیں قیام رہا - اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی - پُر گو شاعر تھے - فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے - مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے - شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور ان کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے رجوع کی ہو - شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا جس میں مولوی امام بخش صہبائی - عبداللہ خاں علوی - مفتی صدرالدین خان آزردہ - غالب - ذوق - شاہ نصیر - احسان - تسکین - حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے - مفتی صدرالدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا - اہل کمال اُس میں جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے - نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا چاہا کرتا ہے -

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او      ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ اُنکی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوے کہتے ہیں۔

غالب زحسرتی چہ سرایم کہ در غزل      چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

نواب صاحب کو سفرِ حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہوگئی تھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادات اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہوگئے تھے۔

تصانیف میں ایک فارسی دیوان، ایک اُردو دیوان۔ ایک مجموعہ انشاے فارسی، جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیب السالک، اِلیٰ اَحسنِ المسالک، جس کا فارسی نام رہ آورد ہے۔ اور ایک مبسوط تذکرہ شعراے اُردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشن بیخار اُن کی یادگار ہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی اِن کو یہی شہرت حاصل تھی اور اُردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بیخار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کیگئی ہے۔ اُردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومن کے پیرو ہیں۔ اُن کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ اُن کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ اُن کے اُردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے اُن کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں نے اُن کا اردو و فارسی کلام [illegible]

دیباچہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر شائع کیا۔

**تسکین ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۶۸ھ**

میر حسین تسکین میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہوئی تو رام پور آرہے۔ جہاں نواب یوسف علیخاں نے اُن کی بڑی قدردانی کی۔ چندروز رام پور میں آرام سے بسر کرکے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۰ھ میں رامپور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اسقدر ہمرنگی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کردیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہوجائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی رامپور میں نواب کلب علیخاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔

**نسیم دہلوی**
**۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۳ء**

مرزا اصغر علیخاں متخلص بہ نسیم نواب آقا علیخاں کے بیٹے تھے دلی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علیخاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرکے مِلنا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں

رہے مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی جو اُن کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ ان کے بعد منشی طوطارام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جسوقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اُسوقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے زود گو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اسقدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اُس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جسکی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ اُن کا دیوان اُن کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اُس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اُسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوے۔ جن میں عبداللہ خاں مہر۔ منشی اشرف علی اشرف۔ منشی امیراللہ تسلیم مشہور ہیں۔

**طرز کلام** نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ اُن کا نہایت ہی لطیف طرز بیان نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے اِن کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے اپنے استاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں اور نازک خیالی اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی اُنھیں کے پیرو ہیں نسیم کا مرتبہ شعرا ے درجہ دوم

بہت برتر ہے۔

ذوق ۱۲۰۴ لغایت ۱۲۷۱
مطابق ۱۷۸۹ لغایت ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جن کو نواب لطف علیخاں رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھکر مشہور ہوے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اُنھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوق بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر اُن کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُن کو بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اِس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اُس وقت دلی میں بڑا شہرہ تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار اُستاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی اُنکی غزلوں کو بلا اصلاح پھیر دیتے کبھی منہ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں طبیعت پر زور ڈال کر کہو ادھر ذوق کو اُن کے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا۔ غرض کہ انھیں وجوہ سے رشتہ

اُستادی و شاگردی منقطع ہوگیا۔ ذوق اپنے کلام کو بنظرِ اصلاح خود دیکھنے لگے اور اُنکی درستی و چستی میں بڑی کدوکاوش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام نے جلد شہرت حاصل کرلی اور اُن کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابوظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نوآموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ اِن مشاعروں میں اکثر پُرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراقؔ، احسانؔ، شکیباؔ، قاسمؔ، عظیمؔ، منتؔ وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں بتوسط میر کاظم حسین بیقرارؔ ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیرؔ دلی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولی عہد سلطنت ظفرؔ کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً اُن کو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوقؔ کے سپرد ہوگیا جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی انکی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہوگئی اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر اُن کو اُستاد ماننے لگے۔ دلی میں نواب الٰہی بخش خاں متخلص معروفؔ (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوقؔ کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزاد) ذوق کے شاگرد ہوگئے اس وقت ذوقؔ کی عمر تقریباً بیس سال تھی اِن دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوقؔ کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ اُن کو اپنے کلام کی پختگی ء

صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آیندہ اُن کے کام آئی کیونکہ اُن کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاہش کرنا پڑتی تھی اور اُن کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جرأت، کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنانا پڑتا[1] تھا۔

**شاہ نصیر سے معرکہ** جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علمِ اُستادی پھر بلند کیا۔ ادھر ہونہار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کدوکاوش نے اور بڑھا دیا تھا مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہوگئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جسکی ردیف تھی "آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل دلی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُس کو میں اُستاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارزطلبی پر ذوق نے مقابلہ کا بیڑا اُٹھا لیا اور ایک غزل اور تین قصیدہ لکھکر تیار کیے شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کرایا۔ جس کے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلہ میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے اُن کی اُستادی مُسلم ہوگئی۔

---

[1] مُصنفِ تذکرۂ گلِ رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے ظفر مرحوم کی کاوشِ فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معروف کے) بھی نتائجِ فکر کو اپنے اُستاد ذوق کے دامنِ کمال سے وابستہ کیا ہے باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اِس وقت پچاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر جوشِ عقیدت میں اسکا خیال نہیں رہا۔" (تذکرۂ گلِ رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۴) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالبِ مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقے سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ۱۲

اُن کے اعلیٰ قصائد[1] کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو "خاقانی ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابو الظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو اُنھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا ؎

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگ شفق
ہے ذرہ تیرا یہ تو انورِ سحر رنگِ شفق

اِس کے صلہ میں اُنکی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہوگئی اور پانچ سے سات رفتہ رفتہ سو تک اضافہ ہوا تھا اور عید بقر عید کے موقع پر خلعت وانعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو اُنھوں نے قصیدہ کہکر گزرانا[2] ؎

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحبِ صحت ہے ہر موج صبا

اِس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

ایک گانوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر اسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال[3] کیا۔

---

[1] مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب وایلولہ ہوے نشو و نمائے گلشن

[2] غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا یہ مطلع ومقطع ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوے مہر ومہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

[3] ظفر نے تاریخ کہی

شب چارشنبہ بماہ صفر
بحکم خداوند جاں داد ذوق

ظفر روے اردو بہ ناخن زغم
خراشیدہ فرمود اُستادِ ذوق ۱۲۷۱ھ

ذوق اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لیے مشہور تھے۔ بڑے خدا ترس اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ۔ شعر گوئی ان سب پر حاوی تھی۔ اس میں ان کو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی اُنکی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دُنیاوی ترقی کے حوصلے اُن کو مطلق نہ تھے۔ دِلّی سے اُن کو اسقدر محبت تھی کہ جب راجہ چندولال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مُربی تھے، اُن کو حیدرآباد بُلوا بھیجا تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھکر بھیج دیا ؎

ان دِنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن　　کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب و زینت بلکہ آرام و آسائش تک کا سامان مہیّا نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعر و سخن میں محو و مستغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دِن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

**تصانیف** ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعر و سخن کی مشق میں صرف کیے ہوں اور سوائے شعر و سخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو امید کیجا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہونگے۔

اسمیں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہوگیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُن کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ تبلایا ہے کہ اُن کا جسقدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُنکی اور حافظ غلام رسول ویران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ[1] ہے۔

ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جنکی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جسکا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضائع ہوگیا۔ اُنھوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جنمیں سے اکثر ضائع ہوگئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کیواسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیا ور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

**ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ**

ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے، محاورات اور مثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا برمحل استعمال۔ فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زور تخئیل اور بلندی مضامین، یہ سب چیزیں مل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اسقدر

[1] مصنف خمخانۂ جاوید اس سعی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی ۱۲

نہیں پائی جاتی -

**انداز کلام** ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے۔ اُن کے یہاں تشبیہات و استعارات اور دیگر صنایع بدایع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوے ہیں جسکی وجہ سے شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے اُن کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے۔ اعلیٰ تخئیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے سُست اشعار اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سودا سے کیا جا سکتا ہے اور انھیں کے وہ متبع تھے بھی مگر اُن کے یہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے مثلاً خواجہ میر درد۔ اور جرأت و مصحفی قصیدہ میں وہ کامل استاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لیگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے اکثر قصائد ضائع ہو گئے۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخئیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بیمثل نمونے ہیں۔ اِس صنف میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اُن کی غزلیں، تازگی مضامین، خوبی محاورہ سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی اور جرأت، سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستۂ گلہائے رنگارنگ کہنا بیجا نہیں۔ اِن کی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔

ایسی صورت میں جب انکے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے۔ جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ اعتراض بیجا بھی نہیں ہے۔ نازک خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اُردو کے بہترین شعرا میں اِن کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

**شاگرد** اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت نامور ہوئے ہیں۔ اُن کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسمٰعیل، جو اُن کے فرزندان روحانی کی طرح زمانۂ غدر میں دُنیا سے اُٹھ گئے۔

**ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء** سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلی کے باشندے تھے، اُن کے والد ابو ظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد مرصع رقم خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن سے بچپنے ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھجر۔ سونی پت نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے وہاں چار برس رہے اس کے بعد دلی آئے اور محکمۂ جنگی میں ملازمت مل گئی اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ ان کے مضامین کو ہمارا جہ

شیودھان سنگھ والی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو الور بلوا بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ مجبور ہو کر پھر دلی آئے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش انیس سال رہے۔ والی ریاست کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چندروز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علیخاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے اُن کے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لیکر حیدرآباد گئے۔ جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی۔ مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشاں حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اُنکی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پرگو شاعر تھے تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستان سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جسمیں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں، اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کا

رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود اُنھوں نے کیا ہے۔

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا نبا ہی طرزِ مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دَور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اِن کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوانِ سخن کے لقب سے مشہور رہیں۔

**انور** سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انور ظہیر مذکورہ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ بے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال اِنتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد تک دِلّی میں ہوا کرتے تھے جن میں داغ، حالی، ظہیر، مجروح، سالک، ارشد، مشاق، وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سُناتے تھے۔ اِن کے دو دیوان ضائع ہو گئے مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق اور پریشان مسودوں سے ایک دیوان جمع کرکے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب، اور مومن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

| | |
|---|---|
| **غالب** ۱۲۱۲ھ لغایت ۱۲۸۵ھ<br>۱۷۹۶ء لغایت ۱۸۶۹ء عیسوی | زبان اُردو کے بہت بڑے ماہر آسمان شاعری کے سب سے درخشندہ تارے اپنے زمانہ کے استاد کامل |

فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسد و غالب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ ان کے اکثر اردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لیئے یہ چند شعر کافی ہیں ؎

غالب از خاک پاکِ تورانیم | لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی | بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک | در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فیض حق را ہمینہ شاگردیم | عقل کل را ہمینہ فرزندیم
بتلاشے کہ ہست فیروزیم | بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم | ہمہ بر روزگار سے خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے، جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدرآباد گئے جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر کئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش

گڑھی کی لڑائی کے موقعہ پر سنہ ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی اِن کا انتقال بھی سنہ ۱۲۲۱ھ میں ہو گیا اُس وقت غالب کی عُمر نو برس کی تھی اسکے بعد اُن کی خبر گیری اُنکی نانہال میں ہوتی رہی اور انکے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق استاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جب اُن کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو ہرمزنام ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، اُنکی ملاقات ہو گئی۔ ہرمز نے آخر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا۔ یہ اُن کے ساتھ تقریباً دو برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کیطرف اُن کو قدرتی مناسبت تھی لہذا اُس سے اُنھوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اس کے فیضان صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ اُنکی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہو گیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۱۶ھ میں آئے جب اُن کے چچا کی شادی نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور خود اُن کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ، جو نواب فخرالدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے سنہ ۱۲۲۵ھ میں انجام



نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

میر مہدی مجروح



جبکہ اُن کا سِن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اسوقت شاعری گونج رہی تھی، مشاعرے جگہ بہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اُسمیں بہت کچھ کہا۔ مگر رفتہ رفتہ اُردو شاعری کی روزافزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ جب کسی شخص کا یہ شعر سُنا ؎

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
اَرے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سُنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہوگئی۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام النّاس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب علی ابن ابیطالبؑ کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا اُنھیں اُسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۳۰ء میں کلکتہ بھی گئے تھے بہ سلسلہ اپنی پنشن کے جو اِن کے چچا کو جاگیر ضبط ہوجانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہوگئی تھی۔ مگر باوجود مُتعدِد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی، اور ایک قصیدہ نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچسو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہوئے تھے مگر دو برس کے بعد جب انتزاع سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہوگئے۔ ۱۲۶۴ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہوگئے تھے۔ مگر قید میں اِن کے مرتبہ کے موافق اِن کا احترام کیا گیا۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لئے جو دلّی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکرٹیری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا۔ اس لیئے اُنھوں نے اپنی کسرِ شان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔ سنہ ۱۲۶۶ھ (مطابق سنہ ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا اُستاد شہ مقرر ہوے اور اصلاح کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلۂ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے پنشن بند ہو گئی اور اُن کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی اور یہ بیگناہ ثابت ہوے تو انکی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علیخاں والی رامپور کے اُستاد بھی تھے جو اُن کو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء بعمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوے۔

**عام حالات اور طبعی عادات**

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوے تھے۔ اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدردانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جسکو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ اُن کی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی محبت و ہمدردی اُن کے خمیر میں پڑی تھی جیسا کہ اُن کے خطوط اور

اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی وگرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔

گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ وثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوے مگر پھر بھی جسقدر اُنکی آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلا تکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُن کو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ اُن کو اپنی خود داری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امرا سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اُس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دلّی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق و مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خانگی تعلقات خاصکر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں

رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپنے میں مر گئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاتر العقل تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے۔ اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو کمال محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں اُنکی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بیجا نہیں ہے بلکہ اُس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُنکی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے۔ جسکی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی انکی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں کہیں اُن کے کلام میں بیزاری کا پَرتو ہے مگر یہ کیفیت تنفّر سے پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں "کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے" اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیئے جسمیں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

**غالب بحیثیت شاعر کے** مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُسکو سب نے تسلیم کیا ہے وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور اُن کے معاصرین بھی اس بارہ میں اُنکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُن کو فارسی سے اسقدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے۔ اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اسقدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے کلام کا قدردان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیا ور ید گر اینجا بود زباندانے　　غریب شہر سخنہاے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگیٔ قسمت ہے کہ اُن کی شہرت کا باعث اُنکی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جسکی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے سہ

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال　　مانی وارژنگم وآن نسخۂ ارتنگِ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیلِ ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں اُنکی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے اُن کو پڑھا تھا۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اُس پر اتنا اِعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لیکر پڑھتے اور خود کبھی نہ مُول لیتے تھے۔ فی البدیہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اُس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمایش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہدیے تھے۔ عربی میں گو اُنھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فنِ عروض کے اُستادِ کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کماحقہٗ واقف تھے اور اُس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا[۱]۔ البتہ فارسی میں بہت سے

---

[۱] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُن کے اردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں اُن کے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات مرزا مسیتا بیگ

زسالِ واقعۂ میرزا مسیتا بیگ — نہ آنت راست شمارِ ائمۂ امجاد

صحیفہائے سماوی مبیّن از عشرات — حدیقہائے بہشتی مشخص از آحاد

بحرمتِ دہ و دو ہادی و چہار کتاب — کہ در نشیمنے از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔ اسیطرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں۔

جُستم از سال رحلتش اثرے — گفت غالب کہ خود ز روئے شمار

از بروجِ سپہر جوئے آت — عشرات از کواکبِ سیّار

گفتم آحاد گفت شرمت باد — از خدا وند واحدُ القہار

اسمیں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنے کُل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲

نوحے موجود ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُن کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جسکی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک مصور کی چابکدستی کے ساتھ مِل گیا تھا۔

تصانیف — حسب ذیل تصانیف اُنکی یادگار ہیں۔

(۱)۔ عود ہندی (۲) اُردوے مُعلّی۔ (۳) کلیات نظم فارسی۔
(۴) کلیات نثر فارسی۔ (۵) دیوانِ اُردو (۶) لطائف غیبی
(۷)۔ تیغ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ
(۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو۔
(۱۳) سبد چین۔

"عود ہندی" اور "اُردوے معلّی" اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں "لطایف غیبی" مباحثہ میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے "تیغ تیز" اور "نامۂ غالب" بھی اُسی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

"پنج آہنگ" میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں "کلیات نظم غالب" اُن کے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے "مہر نیمروز" تاریخ ہے۔ مرزا نے اسکو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اسکی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لیکر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد

له دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۲ نمبر ۱۲

میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ "دستنبو" میں گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اُسکے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کیئے ہیں۔ "سبد چین" میں چند قصائد و قطعات فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

**مرزا صاحب سے مباحثے**

پہلا مباحثہ اسطرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے اُن کے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کیے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا ؎

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را　　چہ شناسد قتیل و واقف را

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذۂ اہل زبان پیش کیے اور کہا ؎

فٹ نوٹ (حاشیہ متعلق صفحہ ۴۸۳)

؎ مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جنمیں سترہ قصیدے حسب تفصیل ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

| نام ممدوح | تعداد قصائد | نام ممدوح | تعداد قصائد |
|---|---|---|---|
| کوئن وکٹوریا | ۳ | مسٹر اسٹرلنگ | ۱ |
| لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل | ۱ | ولیم فریزر | ۱ |
| لارڈ الن برا ایضاً | ۲ | مسٹر کالون | ۱ |
| سر چارلس مٹکاف ایضاً | ۱ | لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل | ۱ |
| جیمس ٹامسن | ۱ | مسٹر ایڈمنسٹن | ۱ |
| مسٹر پرنسپ | ۱ | لارڈ کیننگ گورنر جنرل | ۱ |
| ٹامس میٹکف | ۱ | مسٹر منٹگمری لفٹننٹ گورنر | ۱ |

اِن کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں ۱۲

دامن از کف کنم چگونہ رہا ‏ ‏ ‏ ‏ طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را ‏ ‏ ‏ ‏ آں ظہوری جہانِ معنی را

مخاصمین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور بر افروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی "باد مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر اعتراض کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا اور "قاطع بُرہان" نام رکھا۔ اُس کے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کر کے اُس کا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے بلکلتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "مؤید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "تیغ تیز" سے دیا۔ اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامۂ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بیموقع ہے۔ مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے اُستاد کامل تھے اور اُن کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی۔ بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

**غالب کی شاعری کے تین دَور**

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کیجا سکتی ہے جس سے اُنکی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا ؎

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر با اینہمہ اُنکی ذہانت و طباعی اور اُن کی فطری شاعری کا پورا اثر اُن کے اُردو کلام میں بھی اُسیطرح جلوہ گر ہے جس طرح اُن کے فارسی کلام میں ہے مرزا کا اُردو دیوان تقریبًا اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہوگا مگر اُس کو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گرانقدر سرمایہ سمجھنا چاہیئے۔ مرزا کی شاعری کا پہلا دَور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ اُنھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تا عمر پچیس سال جبکہ اُنھوں نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور اُسمیں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصۂ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے۔ اور اُس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو اُنھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں اُن کو پسند تھیں۔ اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازکخیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرونِ وسطےٰ کے اُن یورپی شعراء سے ملتی جُلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "یوفیوئسٹس" کہتے ہیں۔ اس دَور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازکخیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب　　ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

"طرز ناز کخیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں بعض اوقات اُن کی یہ بلند پروازیاں اور نازکخیالیاں اسقدر بلند ہوجاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہوکر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے۔ ایسے ہی اشعار پر "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ اُن کے مزاج کی اُفتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے شاعری میں بھی اُنھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا۔ اور فارسی کا ذوق اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلۂ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف تبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ اُن کے معرف بھی ہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا۔ بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جسمیں نہ صرف بیدل کی پیروی ترک کی بلکہ اُس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کردیا۔ اُن کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ عجیب و غریب تشبیہیں۔ ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں

وہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو اُن کے بعد کے کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ اِن کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اُردو کی آمیزش محض اسوجہ سے ہے کہ شعر اُردو کہا جا سکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے۔ گو اُن کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ

**قطعہ**

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُن کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آیندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اُنکی اس دَور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور اُن کی اُفتادِ طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آیندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ اِن کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازکخیالیاں نئی نئی تخئیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں اوکسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولٰنا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخر کار یہ رنگ ترک کرکے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازکخیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اسمیں زبان صاف ہو گئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتدبہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک

پر لطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دور اُن کے کمال فن کا لُب لُباب اور ارتقاے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اِس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لُطف دیتی ہے۔ اُن میں ایجاز کے ساتھ سادگی سلاست وروانی نازکخیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجۂ احسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعراے اُردو کی صف اولین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

**غالب کے خصوصیات**
**پہلی خصوصیت جدت پسندی**

ہماری راے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بُنیاد۔ اُن کی جدت طرازی پر قائم ہے۔ جسمیں جدّت تخیل، جدّت طرز ادا جدت تشبیہات، جدّت استعارات، جدّت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات اک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہوجاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور اُرجینلٹی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معما کی سی صورت پیدا ہوجاتی ہے جس کا حل ایک خاص لُطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعراے اُردو اور نیز بعض شعراے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں

معاملہ برعکس ہے جس سے اُن کے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے اُن کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں خلاف اِن کے تُک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی　　ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

**دوسری خصوصیت نظر فریب طرز تحریر،**

اسی سے تعلق اور ملتی جلتی اُن کے کلام میں نظر فریبی اور بات سے بات پیدا ہونا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اُس کے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علٰحدگی ہے جس کا شوق بلکہ عشق اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے تخلص بدلنے کا واقعہ جسکا ذکر اوپر ہوا اسکا بیّن ثبوت ہے۔ اِسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرز تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اِسی علٰحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط، اُن کے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا　　ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

اِن کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علٰحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے اسیوجہ سے اُنکی شاعری سے عام دماغ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اُنکے الفاظ میں خیالات کا اسقدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالینگے ع آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے ؛

**تیسری خصوصیت**
**ذاتی جذبات کا ادا کرنا**

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے اشعار اُن کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم والم کے نالے کہیں اُن کی ماندِ عظمت کا مرقع، کہیں اُنکی حرماں نصیبی، کہیں ہجوم ناامیدی، کہیں جانکاہ مصائب کہیں سعی بیجا حاصل، کہیں دُنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی سے دل بستگی اور اُسکی خوشی اور اُس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ اُن کے لطیف اشعار اُن کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح بیرامیٹر ہیں۔

**چوتھی خصوصیت**
**فلسفیت اور حقیقت طرازی**

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُنکے اکثر اشعار حقایق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ رموز و حقایق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرّا تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اور اُن کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ انپر پوری طرح عامل تھے۔ اُنکی زندگی مذہبی رواداری، آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسیطرح انکا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے کہتے ہیں ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اسمیں نہریں جاری ہونگی اور وہی سب لطف حاصل ہونگے جو دُنیا میں ہوتے ہیں وہ متفق نہیں بلکہ اسکو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ؎

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اُن کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدأ سے جُدا ہو جاتی ہے۔ نغمۂ زندگی کو ایک نالۂ نے سمجھنا چاہیے جو نیستان سے جُدا ہونے پر نے بے اختیارانہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

7 نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی وغم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کسقدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظہر روح حیات ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

**پانچویں خصوصیت جذبات نگاری**

حقایق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے اُنکے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں، جو لازمۂ زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کیگئی ہیں گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جسکے ساتھ دور سے قضا کے قہقہونکی آوازیں آ رہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شلی کیطرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ اُن کو اُنکے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ اور اُن کے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کیجائے۔ چنانچہ کہتے ہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ اِنکے اشعار کو پڑھکر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر اُسمیں ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

**کلام میں ظرافت و شوخی** مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُسکو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دُھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اُن کی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔

[redacted]



مگر ان کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھکر پھکڑ نہیں ہو جاتی۔اور متین سے متین آدمی اُس سے لُطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔

اُن کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں ۔سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اسطرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ۔اُنکی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے اُن کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے رہتے ہیں جنکی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے ۔

غالب ایک کامل مصوّر ہیں اور اُن کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے ۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں     تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب     یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے     خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قوت ایجاز حاصل تھی۔اُن کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بےمثل نمونے ہیں ۔مثلاً

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد     مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پُر تاثیر ہے۔ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر در پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے ۔یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہ گار کی تصویر ہے جو خدا سے بیدھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ

اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[1]

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے

علو خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت وطباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھکر ہیں۔ مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوے ہیں گو کہ مومن اسمیں بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہمعصر یا قریب العہد تھے اُن کے کلام کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱)۔ رابرٹ براوننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سنیٹسبری براوننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقایق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں اُن کا کلام مثل مولنا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے مگر حقائق اور رموز کا اِن کے کلام میں جابجا پر تو موجود ہے۔ ان کو صوفی براوننگ کہنا بجا ہے۔ ہرچند کہ براوننگ کے کھُرّے پن اور اکھڑ پن سے اِن کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن ویاس میں اُن کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے

---

[1] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہذا اُن کی حسرت کی بھی داد دی جائے یعنی اُسکا ثمرہ نیک ملے۔ اس آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔ ۵ سورۃ النازعات

خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدمقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل دراک صوفی کی نگاہ۔ دوربین۔ چابکدست مصور کا نازک ہاتھ۔ اُن کی صنعت پُرکاری اور پرکاری صنعت ہی۔ اور حُسن حق ہے اور حق حسن ہے وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اُن کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ اُن کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اُسکا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جاسکتا ہے۔

**غالب کے شاگرد** غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں تخلص کہ اُن کے عزیز بھی تھے۔ میر مہدی مجروح مرزا قربان علی بیگ سالک۔ خواجہ الطاف حسین حالی مصنف یادگار غالب۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ نواب علاء الدین خاں علوی۔ زکی۔ عزیز۔ مشاق و جوہر وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں[1]۔

---

[1] مصنف کتاب بابو رگھوپتی سہائے صاحب و مسٹر صلاح الدین خدابخش اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے انھوں نے بہت فائدہ اُٹھایا۔

**میر مہدی مجروح متوفی سنہ ۱۹۰۳ء**

میر مہدی مجروح خلف میر حسین فگار مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد دِلّی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلی میں گونہ امن وامان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دِلّی آگئے۔ اور اپنے قدیم مشغلۂ شعر وسخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ بعد چند روز کے بتلاش معاش الور گئے جہاں مہاراجہ شیو دہان سنگھ والی ریاست نے انکی قدردانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رامپور کی قدردانی اور عنایت ومہربانی سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بفراغت زندگی بسر کی سنہ ۱۳۱۶ھ میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف وسادہ اور شیریں ہے چھوٹی بحروں میں اُن کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے۔ خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدت ان کے کلام میں نہیں ہے۔ مگر طرز ادا اُستادانہ ہے اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف تھے۔ میر مجروح اُن لوگوں میں ہیں جنکو اُردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیے ۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالب کے اکثر دلچسپ خطوط عود ہندی اور اُردوئے معلی میں ان کے نام موجود ہیں۔

**سالک متوفی سنہ ۱۸۹۳ء**

مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دِلی ہے۔ غرضکہ دِلّی میں نشوونما پائی پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر جب اُن کا انتقال ہوگیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا

غدر کے زمانہ میں یہ دلی چھوڑ کر الور چلے گئے جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے
اس کے بعد حیدر آباد گئے اور وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدر آباد
میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا
سالک کچھ عرصے تک اُسکے مدیر رہے ۱۲۹۱ھ میں حیدر آباد ہی میں انتقال کیا۔
"ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔
کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے مگر جدت سے خالی ہے۔
اُن کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے اُستاد غالب کا مرثیہ بہت پُر زور اور درد انگیز ہے

زکی متوفی ۱۹۰۳ء

نواب سید محمد زکریا خاں رضوی متخلص بہ زکی ایک عالیخاندان
شخص تھے۔ دلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید محمد خاں اور
نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ متخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور شاعر
اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گو شعرا کا ہے۔ زکی کی تعلیم
دلی میں ہوئی اور اُن کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فن
طب حدیث وفقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی
اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولنا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم
درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے ان سے کچھ
قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے۔
مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے۔ زکی کو شعر وسخن
سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے
تھے شعر وسخن کی محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور اُن کے طرز کے متبع تھے۔



مرزا حاتم علي مہر



نواب سید محمد مرزا خان ددی دہلوی

خیال آفرینی اور جدت تخئیل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ البتہ درد و اثر اسقدر کلام میں نہیں ہے مثل ظہیر و انور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ۔ گورکھپور الٰہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کرکے سنہ ۱۹ء میں بدایون میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن پائی اور وہیں سنہ ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا اُن کا دیوان اُن کی زندگی میں چھپ گیا تھا اپنے زمانہ میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے۔ بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی تخلص زیادہ مشہور تھے۔

رخشاں متوفی سنہ ۱۸۸۳ء نواب ضیاء الدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں و نیّر۔ نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں کے نام منتقل کردی تھی جسکا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے۔ نیّر اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا اُن کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیّر اپنے زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتے تھے اور شعر و سخن کے بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں انکی جامعیت اور معلومات سے بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں متخلص بہ ثاقب نیّر کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی کے بھتیجے اور غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شعر اُردو و فارسی دونوں میں کہتے تھے سنہ ۱۸۶۹ء میں عین عالم شباب میں بعمر اُنتیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں متخلص بہ طالب، جن کی ولادت

سنہ ۱۸۵۲ء میں ہوئی، اپنے بڑے بھائی ثاقب اور اُن کے مرنے کے بعد میر مجروح و سالک و حالی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک دلی کے آنریری مجسٹریٹ رہے پھر سنہ ۱۸۷۹ء میں پنجاب کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں متخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں۔ اُن کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی اور یہ وہی مرزا باقر علیخاں ہیں جنکو غالب نے پالا تھا۔ تاباں اب حضور نظام کے پنشن خوار ہیں۔

نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں داغ کے ایک سر برآوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزردہ سنہ ۱۲۰۴ھ لغایت سنہ ۱۲۸۵ھ

مُفتی صدرالدین خاں آزردہ خلف الرشید مولوی لُطف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور متبحر عالم تھے۔ اُس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھکر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور مولنا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا۔ عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا عربی، فارسی، اُردو، تینوں زبانوں میں اُن کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کے علم و فضل کی اسقدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علیخاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے اُن کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ سرسید مرحوم بھی اُن کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ اُن کو



مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی شارح دیوان غالب



نواب مرزا سعدالدین احمد خان طالب دہلوی

درس وتدریس کا اسقدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالب مومن ذوق شیفتہ وغیرہ اُن کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوے اور نصف جاگیر ضبط ہوگئی آزردہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں اصلاحِ سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبرآبادی اور آخر میں میر ممنون سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف سلیس اور پُر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتّب نہیں کیے گئے۔ اُن کا ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا اُن کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اسقدر نہیں ہے جتنی کہ اُن کے علم وفضل کی ہے

# باب ۱۳

## دربار رام پور و حیدر آباد

## امیر و داغ کا زمانہ

بعد انتزاع سلطنت اودھ اور غدر ۱۸۵۷ء جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابوظفر بہادر شاہ قید کرکے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دلی جو ایک عرصہ تک اُردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

**مٹیا برج کلکتہ میں شعرا کا مجمع**

وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے اُن میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا اُن سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا برج میں اُن کے ساتھ تھے سبعہ سیارہ کا خطاب دیا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے بھی سرفراز تھا۔ اِن لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرماگرمی تھی مشاعرے آئے دِن ہوا کرتے تھے اور مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔ اُن سبعہ سیارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا بعض شعرا کے نام یہ ہیں :-

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارۂ جنگ متخلص بہ درخشاں۔ الک الدولہ صولت گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہار شاگرد رشک۔ عیش مظفر علی اسیر۔ جو غزل میں صبا کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل متخلص بعالم اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں واجد علی شاہ کی تھیں اُستاد تھے۔ اسی پُر لطف مجمع میں داغ اور نظم طباطبائی بھی پہونچ گئے تھے۔ ان صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اُردو کا بنگال میں بہت چرچا ہو گیا تھا۔ وہاں کے مقامی شعرا میں اُس زمانہ میں مولوی عبد الغفور نساخ جو اُسوقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ نساخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے۔ چنانچہ تذکرۂ سخن شعرا، دفتر بے مثال، قطعۂ منتخب، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نساخ، گنج تواریخ، قند پارسی، ارمغاں، باغ فکر وغیرہ اُن سے یادگار ہیں۔ دبیر و انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ اور مفید ضرور ہے۔ اُن کے مشہور شاگردوں میں انسخ تھے۔

**شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں**

پہلا سفر شعرائے دہلی کا اپنے وطن مالوف سے جسکا اشارہ صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے چند اسباب پر مبنی ہے اور وہ یہ ہیں یعنی افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی اُن کے ہاتھ سے شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش معاش کی دقتیں۔ شعرا کی بیقدری اور بیکاری بس یہی وجوہ تھیں جنکی بنا پر شعرا اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لئے نکل جانے پر مجبور ہوئے

چنانچہ فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد، مرشد آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شوریدہ بختوں کو اپنی آغوش محبت میں بے تکلف جگہ دی۔ فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے۔ مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رؤسا وہاں کم تھے لہذا شعرائے دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

| فرخ آباد | فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند جو نواب احمد خاں بنگش کے ایک معزز رُکن دربار تھے۔ خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے۔ شعر و سخن میں اُنھوں نے میر سوز سے اور جب مرزا سودا دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو اُن سے بھی اصلاح لی تھی۔ سودا نے انکی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسرِ اقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہو گیا۔

| پٹنہ۔ عظیم آباد | مہاراجہ شتاب رائے جو اُس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔ شاعروں کے قدرداں اور خود بھی شاعر یکتا تھے۔ اُن کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیا، معاصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علیخاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہونچ گئے تھے اور اُنکی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے۔ میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

**مرشدآباد** نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرائے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قدردانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرت معاصر میر و سودا مرشد آباد گئے اور آخر الذکر وہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔ مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے یہ اُس زمانہ کے ایک مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے۔

**ٹانڈہ** ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رامپور کے قریب واقع ہے نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعرا نواز تھے۔ اُنھوں نے پہلے میر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاندپوری کو جو خواجہ میر درد و سودا کے شاگرد تھے طلب کیا اور ان کو وہ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اور انھیں کے شاگرد بھی تھے مصحفی۔ قدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلہ خوار رہ چکے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رامپور ۱۱۹۸ھ میں ہوا۔

**حیدرآباد** پہلی مرتبہ شعرا اس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دور و دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پنڈاریوں کی غارتگری کی وجہ سے پُرخطر تھا۔ مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہونچ ہی گئے۔ چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد پہونچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی۔ اُن کے ایک شاگرد راے گلاب چند ہمدم نے "اُستاد از جہاں رفت" تاریخ کہی۔ شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدرآباد گئے تھے۔

فیض آباد و لکھنؤ

انتخاب فیض آباد کے وجوہ :-

(۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعرا کی قدر وہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) امتہ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلی والوں سے کمال محبت اور ہمدردی تھی۔ اور اُن کے ساتھ علیٰ قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اس وجہ سے لکھنؤ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبت نصیب ہو گیا تھا۔ کچھ شعرا ہی پر موقوف نہیں، دہلی کے تجار، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرضکہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت تھے۔ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آدھی دلی ادھر کھنچ کر آ گئی تھی۔ برخلاف اس کے ریاستہائے نظام و ٹیپو سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلی سے بہت دور تھے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس کو اپنا مستقل دارالحکومت بنا لیا تو یہ ساری محفل وہاں سے اُٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں یا اُس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہونچ گئے تھے یعنی مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، مرزا محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علیخاں عیشی شاگرد قتیل، جعفر علی حسرت، بقاء اللہ خاں بقا، میر حسن، میر ولی اللہ محب شاگرد سودا۔ میر حیدر علی حیران شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ، میر ضاحک

میرزا فاخر مکین، میر غلام حسین برشتہ شاگرد میر ضیا، فغاں، قائم مصحفی، انشا، جرأت، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعرا بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعروسخن کو گرماتے رہے نیز مرزا جواں بخت ولیعہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رہکر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیماں شکوہ، مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے تزک واحتشام سے لکھنؤ میں رہتے تھے انکی وجہ سے بھی شعروشاعری کو بہت فروغ ہوا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عنادل خوش الحان سخن کے دلکش ترانوں اور پُرلطف نواسنجیوں سے معمور اورمست ہو رہا ہے۔

شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا

طرز لکھنؤ کو نقصان پہونچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت اودھ کو سمجھنا چاہیے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ واجد علی شاہ کلکتہ بھیجدیے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جسنے ہماری اُردو شاعری کو سخت نقصان پہونچایا۔ غدر ۱۸۵۷ء اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی وبربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی اسوجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کرکے ہندوستان سے باہر بھیج دیا قلعۂ معلّی کے رہنے والے جو ابتک شعرائے دہلی کا ملجا وماوا بنا ہوا تھا ادھر اُدھر تتر بتر ہوگئے۔ شعروسخن کا کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت وآبرو بھی خطرہ میں پڑگئی تھی۔ انھیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوے۔ اکثروں نے رامپور کا رُخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر وہاں کے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مربّی تھے۔

کچھ لوگ حیدرآباد پہونچے۔ کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً الور جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوے۔ اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک۔ بھوپال منگرول (کاٹھیاوار) مالیرکوٹلہ۔ اور بھاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہوگئے کچھ ان ریاستوں میں مگر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے مختصر یہ کہ رامپور اور حیدرآباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنھوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعرا کا کچھ حال ہم اسی باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ الور نے بھی جہاں کے حکمراں مہاراجہ شیودھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر تصویر۔ تشنہ۔ شاگردان ذوق۔ اور میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ اسیطرح ظہیر اور اُن کے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخرالذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ ارشد گورگانی مالیرکوٹلہ اور بھاولپور میں رہے۔ ٹونک منگرول اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

**ٹونک** والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوے اور اپنے پدر بزرگوار نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۸۶۶ء میں مسند آرائے حکومت ہوے۔ یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ اُن کے دربار میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور

نواب سلیمان خاں متخلص بہ آسد زیادہ مشہور ہیں آسد میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں مثلاً اصغر علیخاں آبرو حبیب اللہ ضبط۔ عبدالرحیم خاں شرف۔ خواجہ سید کرامت علی خلش داغ کے شاگرد تھے انھوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوع دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور سنہ ۱۹۰۴ء عیسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

**منگرول** | کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اِس دور و دراز مقام میں بھی اردو شاعری کا خوب چرچا ہوا جسکی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدردانی کہی جاسکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلّی کے اُسوقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا چنانچہ داغ تسلیم۔ جلال اور شمشاد جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے اس قدردان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کیوجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے۔ جو اُن کو اُنکے مکان پر برابر بھیجدی جاتی تھی۔

**بھوپال** | فرمانروائے ریاست[1] ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا اپنی ریاست کیا بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بجد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ

---

[1] موجودہ فرمانروائے ریاست ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ ہیں ۱۲

مسلم یونیورسٹی اور اسی طرح کی دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انھوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخدلی سے حصہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے اُن کو عنایت کیے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس اُن کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے روپیہ سے قائم ہوئے جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنر پروری کی یادگار رہینگے۔ آپ مختلف علوم وفنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں بہت سے قابل ابنائے وطن کو جو ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہونچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کر دیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اُردو میں شیریں اور بعد کو تاجور اور فارسی میں شاہجہاں تخلص کرتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب سے کر لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے شعرا اور اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ اُردو میں توفیق اور فارسی اور عربی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلص کرتے تھے۔ اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوشگو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رامپور و حیدرآباد نے شعرا کے

اجتماع اور قدردانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ لہذا اُن کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رامپور — ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رامپور میں بمقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعرا کی محنت و جگرکاوی کے بدلے ہمیشہ اُن کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ علما و ادبا، اور شعرا کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر اُنکی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔ اِن کا دربار اسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود اُنکی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اول تو رامپور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رام پور کو یاد کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علیخاں — نواب یوسف علیخاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم دوست ہنرپرور اور شعرا کے مُربّی رئیس تھے خود بھی شاعر تھے اور اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں ناظم تخلص کرتے تھے صاحب دیوان ہیں ابتدا میں حکیم مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے اُن کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔ میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علما، و شعرا اُن کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جسنے اُن کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علیخاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں، ۱۲۸۱ھ تا ۱۳۰۴ھ

نواب کلب علیخاں کے عہد میں جو ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں اپنے والد نواب یوسف علیخاں کی جگہ مسند نشین ہوے اُردو شاعری نے رامپور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریڈرک اعظم بادشاہ جرمنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مربی اور قدردان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعرا کی قدر افزائی کرتے تھے۔ اُن کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زرین عہد کہا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی دانشمندی قدردانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جسکی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی۔ اس ریاست میں اُس وقت کے بہتر سے بہتر حکما، کامل نثار، شعرا، خوشنویس یہانتک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکابدار وغیرہ سب موجود تھے۔ علما کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیرآبادی، علامہ عبدالحق مہندس، مولانا ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ۔ حکما اور اطباء کے طبقہ میں حکیم محمد ابراہیم اور ان کے صاحبزادہ حکیم عبدالعلی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے۔ شعرا کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر شیخ امداد علی بحر،



نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والی رامپور



جناب نواب سید کلب علی خاں بہادر خلد آشیان

امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ حیا۔ جان صاحب آغا جو شرف شاگرد آتش۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد شبیر۔ منصور۔ رضا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ اور سیکڑوں قابل اور لائق شخص پڑے ہوے تھے جنکی پرورش اور قدردانی ریاست کرتی تھی۔ مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلی درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو مصاحب منزل کے نام سے مشہور تھا۔ مگر باوجود ان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے سوائے مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبدالحق اور منشی امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی۔ علاوہ اس کے کسی کو مفت اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے مقرر تھے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام واکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عید بقرعید اور اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی اُنکی خبرگیری خاص طور پر فرماتے۔ قرضداروں کا قرض ادا کردیتے اور مختلف طریقوں سے اُنکو رہین منت کرتے تھے۔

نواب کلب علیخاں نے درسیات معقول ومنقول مولٰنا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی تھیں۔ پہلے اُنھوں نے اُردو وفارسی نثر لکھنے کی مزاولت کی۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں منجملہ جن کے بلبل نغمہ سنج۔ ترانۂ غم۔ قندیل حرم۔ اور شگوفۂ خسروی زیادہ مشہور ہیں۔ فارسی میں اِن کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔

اُردو میں اپنا کلام امیرؔ مینائی کو دکھاتے اور اُنھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے ۔
چار دیوان انکی یادگار اور انکی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں ۔ نشید خسروانی ۔
دستنبوء خاقانی ۔ دُرۃ الانتخاب ۔ اور توقیع سخن ۔ نواب صاحب نواب تخلص کرتے
تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے ۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا ۔ اور الفاظ
کی صحت و عدم صحت کے مُناظرے اُن کے سامنے اکثر ہوا کرتے
تھے جن میں بحرؔ تسلیمؔ ۔ جلالؔ ۔ امیرؔ ۔ اور منیرؔ وغیرہ ، جو اس فن خاص میں خاص
بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے ، نمایاں حصہ لیتے تھے ۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا
بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے ۔

اس اجتماعِ شعرا کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اسکی وجہ سے دلی اور لکھنؤ کے
مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بُنیاد پڑی جسکی ابتدا ، نواب
یوسف علیخاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی ۔ یہ اُردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب
مسئلہ ہے جسکی طرف کافی توجہ ابتک منعطف نہیں ہوئی ہے ۔ ناسخ کا طرز ان کے
شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے اُستاد کی اُستادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے
بد سے بدتر ہو گیا تھا ۔ ان لوگوں کے کلام میں اُس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے
مگر خوبیاں مفقود تھیں ۔ اس طرز کے برتنے والے رامپور میں بحرؔ منیرؔ قلقؔ اور اسیرؔ
تھے ۔ برخلاف اس کے طرز دلی کے پیرو داغؔ و تسلیمؔ تھے ۔ داغؔ گو کہ ذوقؔ کے شاگرد
تھے مگر اُنھوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا جسمیں جرأت کا کچھ رنگ ملتا جلتا
تھا ۔ اُن میں اور لکھنؤ والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا ۔ اُن کے اشعار بہت مقبول
ہوئے ہر شخص اُن کے رنگ کا دلدادہ تھا ۔ تسلیمؔ گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل

دِلی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے۔ نسیم کے طرز کی کیفیت ہم اُن کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اُن کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا۔ وہ اُس کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے اور جہاں کہیں رہے اپنے اُستاد اور استاد الاستاد یعنی نسیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے اسوجہ سے اُن کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑسکا اور میر حسین تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے۔ مختصر یہ کہ یہ دونوں اسکول یعنی لکھنؤ اور دلی۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہے جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بیجا لفاظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اُسکو شدید نقصان پہونچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مُبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایۂ ناز تھیں رخصت ہو گئیں۔ اب لوگ شاعری کے صحیح جذبات اور اُن کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنؤ کے طرز قدیم کے شیداؤں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے اُن کا رنگ نہیں جم سکتا۔ مجبوراً اُنکو طرز دہلی کیطرف متوجہ ہونا پڑا۔ چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہذا اُن کے معاصرین کو اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ پبلک کی پسند کا اتباع کرتے ہوے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مد مقابل تھے اُن کو بھی اس رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان یعنی "صنم خانہ عشق" داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں۔

اسی طرح اُنھوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں لکھکر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں شاگردان امیر علی الخصوص ریاض جلیل۔ اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ اِن کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علحدہ نہیں کیے جا سکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیے۔ جلال رشک اور برق کے شاگرد تھے اور اُن کی نشو و نما بالکل لکھنؤ کے طرز پر ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا چنانچہ اُن کا ایک دیوان بالکل اُسی رنگ کا ہے۔ اور اسمیں اُنھوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے۔ مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے۔ البتہ ایک بڑی حد تک اُسکی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اُس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہواری رسالے اور اُسکی تحقیقات نے طرزِ قدیم کو لوگوں کے دِل سے محو کر دیا۔

**موجودہ فرمانروائے رامپور** موجودہ فرمانروائے رامپور یعنی ہز ہائینس نواب سید حامد علیخاں صاحب بہادر بجمیع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلاف کرام کے نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربّی اور سرپرست ہیں۔ اِن کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے باکمالوں کا رامپور میں مجمع رہتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ اِن کے جود و سخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درسگاہیں اور مفید تحریکیں ان کے فیوض نامتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی سنہ ۱۲۴۴ھ
لغایت سنہ ۱۳۱۸ھ

منشی امیر احمد مینائی آمیر تخلص خلف مولوی کرم محمد ۱۸۲۸ء میں بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا کے، جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے، خاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علماے فرنگی محل سے پڑھی تھیں اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقوے اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بعیت رکھتے تھے۔ طب جفر نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طباع محنتی اور جفاکش تھے۔ اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں جسطرح اپنی وضعداری اور سادگی کی وجہ سے مشہور تھے اُسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی اُن سے ممتاز تھے۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضاے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی شاگردان آتش و ناسخ کے مناقشے روزمرہ کے مشاعرے جنمیں شہر کے اساتذہ مثل صبا و خلیل و رند و سحر وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، مراثی کے زور و شور اور انیس و دبیر کے معرکے، غرضکہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منچلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق سخن بہم پہونچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا اور اُن کو بُلا کر اُن کا کلام سُنا گیا اور حسب الحکم سلطانی

دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" اُنھوں نے تصنیف کیں۔ جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اُسی وقت سے اُنکی شہرت کا زمانہ شروع ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاق اودھ اور غدر کی وجہ سے شعراے دربار کے تمام حوصلے پست ہوگئے۔ اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ بعد غدر امیر نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر جب عہدۂ صدر امینی کیواسطے صاحب جج کو درخواست دینے کے متعلق اُن سے کہا گیا تو اُن کو یہ بات اچھی نمعلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کردیا۔ تھوڑے روز کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکاں نواب یوسف علیخاں والی ریاست رامپور نے اُن کو طلب کیا جو شعراے لکھنو و دہلی کے اُسوقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا جسمیں اُردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام ہندوستان کے نامی وگرامی شعرا اور باکمالوں کو بلا کر اپنے دامن دولت کے سایے میں لے لیا تھا۔ غرضکہ یہ زمانہ یعنی امیر کے قیام رامپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی میں اُن کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں اُن کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی جسکی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعروشاعری اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے تھے۔ غرض کہ ۴۳ برس رامپور میں نہایت عزت وآبرو سے بسر کرکے جس میں اکثر مرتبہ لکھنو بھی آنا ہوا تھا بالآخر حیدرآباد کو روانہ ہوے۔ وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ ۱۹۰۰ء میں

جب نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپس آ رہے تھے تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے امیر نے ایک قصیدہ اُن کی تعریف میں کہکر بمقام بنارس اُنکی حضور میں پیش کیا تھا حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیر سے حیدرآباد آنے کی فرمائش کی ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ عازم حیدرآباد ہوے ۔ یہاں تھوڑے دِن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوئے اور تہتّر برس دس مہینے کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی علالت کے زمانہ میں داؔغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اُنکی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے جیساکہ منشی صاحب کی اس رُباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

رباعی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا　　رشک دم عیسیٰ ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری　　درماں مرے حق میں ہوگیا درد مرا

داؔغ نے وفات کی یہ تاریخ کہی

ولے ویلا چل بسا دنیا سے وہ　　جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفےٰ آباد سے آیا دکن　　یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
(رامپور۱۲)
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں　　کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیر
مبتلاے حدتِ صفرا و تپ　　موردِ آزار اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب　　درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ　　شاعری میں خاص تلمیذِ اسیر

ہے دُعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصرِ عالی پاے جنت میں امیر
۱۳　۱۸

تصانیف | امیر بہت پُر گو شاعر تھے اُن کی بعض نثر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان موسوم "بہ غیرت بہارستان" سُنا جاتا ہے کہ زمانۂ غدر میں تلف ہوگئے۔ پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں انکی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ موجودہ تصانیف میں جنکی فہرست ذیل میں دیجاتی ہے اُن کے دو دیوان عاشقانہ۔ یعنی "مرأة الغیب" اور "صنمخانہ"۔ اور ایک نعتیہ اشعار میں موسوم "بہ محامد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات" نہایت قابلِ قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ اُنکی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:-

(۱)۔ ارشادُ السُّلطان۔ (۲) ہدایت السُّلطان۔

(۳)۔ غیرتِ بہارستان۔ اسمیں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد در مدح واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہوگیا۔

(۴) نورِ تجلّی۔ (۵) ابرِ کرم۔ یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔ (۶) ذکر شاہ انبیا بصورت مسدس مولود شریف ہے۔

(۷) صبح ازل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔

(۸) شام ابد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔

(۹) لیلۃ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۲۸۳ھ ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار"، "واسوخت اُردو"، "شکایات رنجش"، "صفیر آتشبار"، "حسد اغیار" "غبار طبع"۔ اس مسدس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے۔ (۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مؤلفہ ۱۲۸۹ھ۔



امیر مینائی



داغ دہلوی

نعتیہ دیوان ہے ۔ (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعراے اُردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علیخاں بہادر کے حکم سے ۱۲۹۰ھ میں لکھا تھا جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان آفرینش نثر میں مولود شریف ہے (۱۴) مرأۃ الغیب۔ اُردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے ۔
(۱۵) صنمخانۂ عشق مطبوعہ ۱۳۱۲ھ (۱۶) جوہر انتخاب (۱۷) گوہر انتخاب مؤلفہ ۱۳۱۰ھ۔ یہ دونوں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں (۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اسمیں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔
(۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں اسمیں اُن کا صحیح طریقۂ استعمال معہ اسناد کے بتایا ہے ۔
(۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت اُردو محاورات و الفاظ کی جسکو امیر اللغات کا نقش اول کہنا چاہیئے ۔ (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی ابتک تیار ہوئی ہیں۔ اِس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور نیز اُنکی سجید کدو کاوش اور محنت و جانکاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اسکی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ تیسری بھی تیار تھی مگر شائع نہو سکی۔ ابتداءً آٹھ جلدوں میں اِس کے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علیخاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اُس کے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اسکی سرپرستی کی تھی۔ منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے

(۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر ہیں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہذا اُن کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو اُن کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیرکٹر پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو اُنکی سوانحعمری کا بہت عمدہ مواد اُن سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز اُن میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے۔ رسالۂ اسرار نظم اور "زاد الامیر" اور "مناجات" وغیرہ کو اُن کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیے۔

**شاگرد** منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے جنمیں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیرآبادی۔ وسیم۔ حیران۔ محسن کاکوروی۔ عابد۔ رضا۔ دل۔ قرار۔ ثاقب۔ اصغر۔ مضطر۔ سرشار۔ حفیظ جونپوری۔ آہ۔ اختر۔ قمر۔ اِن میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر۔ اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

**امیر کی شاعری** امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دُنیا میں اُنکی شہرت انھیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ انکا پہلا مطبوعہ دیوان مرآۃ الغیب کسی قدر ناہموار ہے کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھدا اور بیمزہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشاقی اور پختگی معلوم ہوتی ہے مِلی جُلی ہیں۔ اُن کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں یعنی جا و بیجا

رعایت لفظی۔ ابتذال رکیک اور بدنما تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگیا کرتی۔ اور کنگھی چوٹی وغیرہ۔ غرضکہ اسمیں کوئی چیز نئی اور ادر تخیل نہیں ہے بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو اُلٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "صنمخانۂ عشق" اُن کے بڑے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخئیل سلاست و روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں کبثرت موجود ہیں۔ اُن کے نعتیہ اشعار گو کہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلیٰ تخئیل۔ فصاحت و بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں۔ غرضکہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مخمس۔ مسدس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت و بلاغت۔ روانی و سلاست، توازن الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے۔ حشو و زوائد اور صنائع بدایع لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال بلند پروازی۔ شیرینی۔ زور اور قادر الکلامی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ تصوف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے۔ اِس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

**اخلاق و عادات** منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی راستباز، ہمدردی سے بھرے ہوئے نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے، کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اور نہ کبھی ہجو لکھی

سچے پاکباز۔صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے۔اسی وجہ سے اُنکے تقدس اور بیریائی کی شہرت لوگوں میں اُسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم وفضل اور کمالات شاعری کی۔مزاج میں انکسار اور تواضع اسقدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی۔بلکہ تمام اپنے ہمعصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ادبی مسائل کا جو اُنسے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے' اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔قمر۔آرزو۔ضمیر۔اختر۔جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُسکا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔منشی صاحب ایک بہت قابل اور طباع شاعر تھے۔اور اُن کے اکثر اشعار زبان زد خلایق ہیں۔اُن کا مرتبہ شعراے اُردو میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ

چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں۔ہ

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے اب اِس پیرہن کو چھوڑ

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص — ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص
ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار — دیکھو تو بے قراری نخچیر کے خواص
کہتا ہو شعر سُن کے کوئی واہ کوئی آہ — کچھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ — وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چُرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا — سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

کھو گیا دِل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر — جانے دو اک بیوفا جاتا رہا جاتا رہا

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر — آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

مِلا جب وہ کھلا تب یہ معما — کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جُدا ہے دخترِ رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیمجاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چُپکے — ہاتھ اُٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو — ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے — اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں — وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختی جاں سے — ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

وائے قسمت جو سب کی سُنتا ہے — وہ بھی عاشق کی اِلتجا نہ سُنے

باقی ہے اب امیر تو فقط جان کا جانا — ہوش و خرد و تاب و توان جا چکے کب کے

خودی سے بیخودی میں آ جو شوقِ حق پرستی ہے
جسے تو نیستی سمجھا ہے ای غافل وہ ہستی ہے

بڑھا ای آہِ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بُت بولا
جا کے لے لیجئے کعبہ میں خدا رکھا ہے

انگور میں بھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی؟

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک وقت کو پا کر کہ ہو یہ وہ معشوق
کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی

**داغ دہلوی سنہ ۱۸۳۱ء لغایت سنہ ۱۹۰۵ء**

نواب مرزا خان داغ سنہ ۱۸۳۱ء مطابق سنہ ۱۲۴۶ ہجری میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ اِن کا انتقال سنہ ۱۲۵۲ھ میں ہوا جبکہ داغ تقریباً چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعے پہونچے جہاں اُنکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا، داغ کی منچلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہو گئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی

اُستاد ذوق کے شاگرد ہوگئے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی شہسواری۔ بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ فنون اُنھوں نے باقاعدہ اُستادوں سے حاصل کیے تھے شعر کا شوق اِن کو جبلّی تھا۔ اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار شاعر ہوگئے ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے وفات پائی۔ مربی باپ کا مرنا اِن کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے نے اُن کے رہے سہے حواس اور کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوے۔ جب کسی قدر ہنگامہ فرو ہوا تو مع اہل خاندان کے رام پور آئے جہاں نواب یوسف علیخاں بہادر جو اُن کو پیشتر سے جانتے تھے اُسوقت سر آرائے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علیخاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغۂ اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو اُنھوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اسوقت سے اُن کو گھوڑوں اور شہسواری سے دلچسپی ہوگئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علیخاں بہادر کی ملازمت میں رامپور میں گزارے۔ جہاں یہ نہایت عزت و آبرو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اسقدر آرام تھا کہ اُس کو آرام پور کہتے تھے۔ نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوے تھے۔ اُنھوں نے دلی۔ لکھنو۔ پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں اُنکی بڑی قدر ہوئی اور اُن کے واسطے مشاعرے منعقد

آئے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی۔
اپنے قیام کلکتہ کا ذکر اُنھوں نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے ۱۸۸۶ء میں
نواب کلب علیخاں کی بے ہنگام موت سے انکی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھر گیا
اُن کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہونچا تھا رامپور
چھوڑنا پڑا چنانچہ وہ دلی چلے گئے اور وہاں کچھ دِن قیام کر کے نِکلے اور راستے میں
مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے۔
راستے میں لاہور، امرتسر، کشن کوٹ، آگرہ، علی گڈھ، متھرا، جے پور، اور ریاست
منگرول واقع کاٹھیاوار میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے دِن قیام کرتے ہوئے
گئے تھے اور ان سب مقامات میں بیسیوں آدمی اُن کے شاگرد ہوئے۔ پہلی مرتبہ اعلیحضرت
حضور نظام سے بتوسط راجہ گردھاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی مگر چونکہ کوئی
صورت حسب مراد اُس وقت نہیں نِکلی لہذا دلی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ
کے بعد ۱۳۰۸ھ میں سر آسماں جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدرآباد گئے اور اُنکی
مرتبہ قسمت نے یاوری کی اعلیحضرت (میر محبوب علی خاں) کے اُستاد مقرر ہوئے اور
بیش قرار تنخواہ اور انعام واکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان
جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ ظاہر
ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدرآباد میں نہایت کامیابی اور خوشی
و خرمی سے گذرنے لگی۔ اُن کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے
مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے، جو بیش بہا
صلے اور انعام واکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے

وہ اس کے علاوہ تھے۔ حیدرآباد میں داغ کو دنیاوی ثروت کا عروج حاصل ہوا۔ ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اسقدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہو گی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ ان میں ایک ڈاکٹر رائل حیدرآبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے مُنہ بند ہو گئے۔ داغ تقریبًا اٹھارہ برس حیدرآباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لیکر تمام اُمراُو رُوسا اُنکی عزت کرتے تھے اُن کی وجہ سے بازار شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا۔ سیکڑوں شاگرد ان کے حیدرآباد میں ہو گئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہر دل عزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے آخری زمانہ قیام حیدرآباد میں امیر مینائی بھی رامپور سے آگئے تھے۔ اور اُن ہی کے ساتھ رہتے تھے مگر قبل اسکے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داغ بعارضہ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

**عام عادات و اخلاق** نواب مرزا خاں داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور ہشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خودداری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دور رہتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اپنے معاصر شعرا مثلاً جلال، آمیر، تسلیم، ظہیر وغیرہ سے اُن کے تعلقات

بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی بڑی وجہ دربار نظامت میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری

داغ اپنے زمانہ کے بہت مشہور شاعر تھے۔ اُن کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اُن کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے متبعین کثرت سے ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت اُن کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا جس کے کارکن بعض اُن کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اِس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف

چار دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ۔ آخر الذکر یعنی یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں اُنکی وفات کے بعد شایع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ بھی لکھی ہے اِن کے علاوہ چند قصائد حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں، ایک پُرجوش شہر آشوب دلّی کی تباہی پر، اور چند قطعات و رباعیات بھی اُن سے یادگار ہیں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" دونوں رامپور میں چھپے تھے اور اِن میں زیادہ تر وہ

غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ کی ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں اُنکی بے انتہا مشاقی اور نیز بڑی محنت و جانفشانی معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکھن کی تصنیف ہیں ان میں بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو اُن کا خاص انداز ہے، خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ کا آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جسمیں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر برخلاف ان کے مہتاب داغ اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہوکر ضیاے ماہتاب کے مانند نہایت خوشگوار ہوگئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہوکر اُن کی جگہ کہولت کی پختہ کاری اور سکون و اطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی مُنّی بائی حجاب کے ساتھ اُن کو تھا اور جو رامپور کا میلہ بنظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اِس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلی درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی اُنکی قابل داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں اُن کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے اُن میں کسی طرح کے بلند مضامین اور اعلی تخیل نہیں ہیں غزل گوئی کا رنگ اُن پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے

معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔ تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ انکی رباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادب و اخلاق وغیرہ سکھانے کے ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں البتہ تاریخیں بہت اچھی اور اُستادانہ کہی ہیں

**طرز کلام** داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) انکی شہرت عام (۲) اُن کا طرز خاص (۳) وہ خدمات جو اُنھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں داغ میٹھی سُریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو اُنھوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی اسی سے اُن کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی۔ ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت یعنی صنائع بدائع کی کثرت اور دور از کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو و زوائد سے بھی اُن کا کلام پاک ہے۔ اشعار بالکل تلے نپے زوردار اور مؤثر ہوتے ہیں۔ کلام میں زندگی اور چہچاہٹ پائی جاتی ہے۔ ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے جسقدر موضوع ہیں اُن سب پر حاوی ہوتا ہے کہیں شوخ حاضر جوابی، کہیں ظریفانہ بذلہ سنجی، کہیں کسی واعظ پر چوٹ کی ہے، کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسوٹی ہے، کسی جگہ معاملہ بندی میں نیاز عاشقانہ اور ناز معشوقانہ کے بے مثل مرقعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرماں نصیبیوں کا ذکر ہے کسی موقعہ پر رقیبوں کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے غرضکہ اشعار کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس

اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اِس لیے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں اُن کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور رند کی صفائی ملی جُلی معلوم ہوتی ہے اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اُس پر طرہ۔ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اسقدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں پیرو اور ناقل اُن کے پیدا ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر اُن ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار مہیج اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے کہ اُن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک و صاف اور بہت بلند ہیں۔ اُن کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی زر اندود کلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے یہاں اصلیت (اور تخیلیت) اور متانت بہت کم ہے۔ فلسفہ اُن کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ خیال کی شرح و بسط ہے۔ فلسفۂ حیات اور فلسفۂ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اُس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی حُسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ اُن کے معشوق اکثر بازاری ہیں جو اپنے حُسن اور ناز و انداز کو سرِ راہ لیکر بیٹھتے ہیں۔ جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری کے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذب کانوں کے سننے کے لائق نہیں ہیں اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جا سکتے ہیں جہاں مذاق صحیح خواں

جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جمگھٹے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متاثر نہیں ہوتے اور نہ اُن کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جسکو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں نہ اُنمیں میر کا ایسا درد و اثر ہے نہ غالب کی سی معنی آفرینی و نازک خیالی۔ اُنکی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جنکو سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں اُن میں جدت اور ندرت مطلق نہیں ان کی مثنوی (فریاد داغ) میں تو ایک معشوق بازاری کے عشق کا حال ہے جسمیں کوئی بلند "آئیڈیل" مطلق نہیں۔

مگر باایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کیے۔ اور سیدھے سادے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بیساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی اُن کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحریں سریلے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں چسپت اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ غرضکہ انہی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کو اکثر مشہور و معروف لوگوں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔

حالی لکھتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پرزور مرثیہ اُنکی نسبت لکھا ہے۔ اُن کے حریف و معاصر امیر مینائی کا صحیح معنوں میں کوئی مدمقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد — شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں:- اعلیحضرت حضور نظام حیدرآباد خُلد آشیاں یعنی نواب میر محبوب علیخاں متخلص بہ آصف۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ سایل دہلوی۔ بیخود دہلوی احسن مارہروی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرتپوری۔ جگر مرادآبادی۔ آغا شاعر دہلوی وغیرہم۔

امیر و داغ کا مُقابلہ — یہ مقابلہ بھی اُسی قبیل سے سمجھنا چاہیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ اُن کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانہ کے بہت بڑے غزال تھے اور اکثر ہمطرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشاءاللہ بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے۔ دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی۔ داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدۂ انام ہے جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شاعر محظوظ ہو سکتے ہیں اُسی طرح اُسکو پڑھکر یا دوسرے سے سُنکر ایک عامی بھی اُس سے لُطف اُٹھاتا ہے۔ مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے

کلام لیتے ہیں اور جنکو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیر ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُسمیں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعریہ کو بھی پورا کرتا ہے مگر اصل یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتاد طبیعت کو اُس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک بڑے زندہ دل رند مشرب شخص تھے اُن کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا پھر اُنکی نشو و نما دلی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اِس کے منشی صاحب ایک مولوی منش تقدس مآب بزرگ تھے لکھنؤ میں پیدا ہوے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامنِ سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا دوستانہ رکھتے تھے اسیر اُن کے اُستاد اور برق، صبا، بحر، قلق، وغیرہ اُنکے یار تھے۔ پس اُن لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اُس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت اُن کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رامپور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے اُن کا پُرانا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا منشی صاحب کا اوائل عمر کا جسقدر کلام ہے وہ ناسخ اور شاگردان ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ اُن کا پہلا دیوان "مراۃ الغیب" اِس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ اُسمیں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدی اور بیہودہ تشبیہیں، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایت لفظی کی بھی بھرمار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی اُستادی اور قدرتِ کلام کا پتہ دیتا ہے مگر پھر بھی ناہمواری مندرجہ بالا سے مملو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ

دلی میں قائم ہوا مگر انھوں نے اُسمیں کچھ جدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنالیا۔ یعنی جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمو دیا اور اسی سے وہ چیز پیدا ہوگئی جو داغ کا طرزِ خاص کہلاتا ہے یعنی روزمرہ اور زبان، محاورات کا برمحل استعمال، لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دلنشینی، اِن کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصہ بہت سطحی ہے۔ اُن کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ اُن کے مذاق کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز اُن کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب نے داغ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مِٹ جانے کے خیال سے اُنھیں کا رنگ اختیار کیا۔ اور ہرچند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیل رنگ کی وجہ سے اُن کے مابعد کے کلام میں پیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہوگئی مگر پھر بھی وہ داغ تک نہ پہونچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مُعاملہ میں وہ اُن سے کم رہے اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان "صنمخانۂ عشق" "گلزارِ داغ" سے، اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہرحال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرزِ قدیم کو چھوڑ کر طرزِ جدید میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی۔

اگر ایک بلند نقطۂ نظر سے اِن دونوں اُستادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ وہ حقیقی شعریت اور آتش الہامی جو قدیم استادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے۔ مگر باایںہمہ باعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی کے امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے عروض اور ضروریاتِ شعری

کے اعتبار سے امیر بہت بڑے اُستاد تھے اُن کے کلام میں اس قسم کے سقم شاذ و نادر ہی ملینگے۔ اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنفِ خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گو کہ اُن کے معتقدین اس بارہ میں بھی اُنکی افضلیت کے قائل ہیں حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور ایک طرزِ خاص کے موجد تھے اور یہی اُن کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت تو داغ سے یقینی بہت بڑھی رکھتے تھے "امیر اللغات" اور اُن کے وہ خطوط جنمیں اُنھوں نے اکثر نہایت پیچیدہ نکات ادبیہ حل کیے ہیں اُن کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عادل ہیں۔ قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کہے جاسکتے ہیں۔ البتہ ظہیر دہلوی شاگردِ ذوق اِس صنف میں اُن کے قریب ہیں۔ اِن دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عُمر میں کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ اُن کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے جب سے کہ وہ حیدرآباد گئے اور وہاں ثروت و عیش اُن کو نصیب ہوا شاعرانہ جگرکاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رُجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اسقدر مقبول اور مشہور ہے کہ اُس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعلِ عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لُطف اُٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک ● کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا ● خانۂ عشق بے چراغ ہوا

ڈر گئے نام شفا سُنکے نہ ہے خواہش مرگ ● مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا ● کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے ● جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگے داورِ محشر سے ہے اُمید مجھے ● کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا ● عینِ حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا ● جھوٹی قسم سے آپکا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدہ میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ ● ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

وعدے پہ مرے انکے قیامت کی ہے تکرار ● اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

کل تاب فغاں بھی تو یہ تاثیر کہاں تھی ● کیا کیا لب خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ ● ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے ● سب کی ہے تمکو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرت دِل دیکھئے ذرا ● پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ● ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے ● کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

بظاہر رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے ● ترے کوچہ میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی ہوتے ہیں

کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ
رخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں
مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو
گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے
ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

جو غش آتا ہے مجھ پر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
کہ زندہ کوئی بھی تیمار دار باقی ہے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

**جلال لکھنوی**
**۱۲۵۰ھ تا ۱۳۲۵ھ**

حکیم سید ضامن علی جلال حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے لکھنؤ میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی و عربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشۂ طبابت کی تکمیل کیطرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق اُن کو شعر و سخن کا شوق بچپنے ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اسقدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو اپنا مستقل فن قرار دیا ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں کچھ پختگی آگئی تو اُنھیں کے توسط سے اُن کے استاد رشک کے شاگرد ہو گئے۔ رشک اُس زمانے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور اُستاد اسقدر ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے اُن کے پاس آتیں وہ اُن کو بنظر اصلاح رشک کے حوالے کرتے۔ جب رشک سفر عراق پر روانہ ہونے لگے تو اُنھوں نے نوجوان جلال کو

نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اِس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت مثل بحر، سحر، اسیر، امیر، قلق وغیرہ کے شریک ہوتے تھے جلال بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے کلام کو سنتے اور خود اپنی غزلیں سناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ان صحبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور شعرا کو بجائے شعری تخیل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا۔ اِسی زمانہ میں اور انھیں افکار کی بدولت جلال نے ایک دواخانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نندرائے کے مکان میں کھول لیا تھا جو اُنکے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے۔ مگر اس شغل میں بھی وہ اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اُنکی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر نواب یوسف علیخاں والی رامپور کی قدردانی نے اُن کو رامپور گھسیٹ بُلایا جہاں اُن کے والد داستان گویوں میں ملازم تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور والی ریاست نواب کلب علیخاں ہوئے تو اُنھوں نے حکیم صاحب کو بمشاہرۂ سو روپیہ ماہوار ملازم رکھ لیا۔ حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی اُن کو رامپور سے ترک تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریبًا بیس سال رامپور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے جہاں اُن کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کی ان چاروں اُستادوں کی غزلیں جو اکثر ہمطرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ اُن سے تقابلِ کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔

نواب کلب علیخاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف ریجنسی کے قائم ہونے سے یہ پُرلطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعراسب تتر بتر ہو گئے حسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگرول واقع کاٹھیاوار کے رئیس با اختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدردانی اور شعرا کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے، حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کرلیا، مگر وہاں بوجہ دُوری اور ناموافقت آب وہوا وہ عرصہ تک نہ رہ سکے چند ہی دن میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ میں واپس آ گئے جہاں نواب صاحب موصوف اُن کو پچیس روپیہ ماہوار اور مبلغ سو روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ اُن کی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعر و شاعری اور اصلاح کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ بعمر چھہتر سال تاریخ ۲۰۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

تصانیف — تصانیف حسب ذیل موجود ہیں :-

(۱) چار دیوان"۔

(۲) "سرمایۂ زبان اُردو" جو محاورات و اصطلاحات زبان اُردو کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

(۳) "افادۂ تاریخ" فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) "منتخب القواعد" اسمیں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے۔

(۵ و ۶) دو لغات زبان اُردو کے موسوم بہ "تنقیح اللغات" و "گلشن فیض"۔

(۷) "رسالہ دستور الفصحا" جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔



ڈاکٹر سر محمد اقبال پی-ایچ-ڈی

(۸) "مفید الشعرا" ایک رسالہ درباب تحقیق تذکیر و تانیث۔

فہرست مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے اُستاد رشک کے اُنھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اُردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کئے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا اُس کو اُنھوں نے درجۂ تکمیل کو پہونچایا۔ ہر چند کہ اُن کی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور اُن کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اُن کو بچپن سے حجت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں بھی وہ اساتذۂ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف اُن کی غلطیاں اُن کے مُنھ پر کہہ دیتے تھے۔ اور یہ عادت اُن کی آخرِ عُمر تک باقی رہی اسکی وجہ سے اُن سے اور اُن کے معاصرین سے معرکۃ الآرا مُناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

**مزاج کی کیفیت** کہا جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و متکبر اور ہمچو من دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرورِ سخن اُن کو اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں اُن کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی اُنھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوق نیموی نے

دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لیگئی اور اُن کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور اُن پر صدہا اعتراض وارد کئے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام — جلال کو طرز لکھنؤ کا آخری متبع سمجھنا چاہیئے۔ وہ قدیم اساتذۂ لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دلآویزی اور خصوصیت اور مابہ الامتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوے اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے۔ جذبات یا انعکاس کا اُسمیں کہیں پتہ نہیں۔ خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہی معمولی معمولی باتیں ہیں۔ اور بعض اشعار تو اُنکی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے ہوے ہیں مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب و زینت کے مضامین جو قدیم طرز لکھنؤ کا مایۂ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔ جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ کا بادشاہ سمجھتے تھے بہت پُرگو تھے۔ اور شاید یہ پُرگوئی ہی بدمزگی کلام کا باعث ہو۔ مشہور ہے کہ بیس پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف اُن کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کے گلدستے اُنکی اور اُن کے شاگردوں کی غزلوں سے بھرے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے

اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں اُنکا پایہ بلند ہے ۔

**شاگرد** اِن کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں ۔یعنی خود ان کے بیٹے کمال جو ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہو گیا ۔میرزا ذاکر حسین یاس اور اُن کے صاحبزادے آرزو ۔ احسان شاہجہانپوری اور سردار اودھم سنگھ ۔

**آرزو** سید انور حسین صاحب لکھنوی آرزو تخلص خلف سید ذاکر حسین یاس مثل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں ۔لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں ۔ اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین یہی سمجھے جاتے ہیں ۔پہلے اُمید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں ۔فن عروض میں اُنکو پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں ۔مرثیے بھی کہے ہیں اور اب ڈرامانویسی کا شوق ہے ۔گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرز دلّی والوں کا ہے ۔آرزو کا کلام ان کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے طرز کو دلّی کے رنگ میں سمو دیا تھا ۔ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے ۔موجودہ شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں ۔

**احسان** اِحسان علیخاں نام احسان تخلص قاسم علیخاں کے صاحبزادہ ہیں ۔ سنہ ۱۲۷۶ھ میں بمقام اوٹہ ضلع بریلی پیدا ہوئے اسکے بعد ان کے والدین شاہجہانپور چلے گئے جہاں اُنکی تعلیم و تربیت ہوئی ۔سولہ برس کی عمر سے اُن کو شعر کہنے کا شوق ہوا ۔ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں تائب کو دکھاتے تھے سنہ ۱۲۹۸ھ میں جلال کے شاگرد ہوئے سنہ ۱۸۸۶ء میں محکمۂ بندوبست گورکھپور میں سرکاری

ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے سنہ ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہاں پور میں کام شروع کیا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "گلدستۂ ارمغان" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں اُن کا پہلا دیوان "خمکدۂ خیال" چھپا تھا۔ اِس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں منگرول اور وہاں سے حیدرآباد گئے تھے۔ احسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

**تسلیم سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء**

قصرِ شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے سنہ ۱۸۲۰ء میں بمقام منگلسی جو نواح فیض آباد میں ایک گانوں ہے پیدا ہوئے ان کے والد مولوی عبدالصمد پہلے بدوسرائے میں جو دریاآباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے۔ بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آگئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیغۂ فوج میں بمشاہرۂ تیس روپیہ ماہوار ملازمت کر لی۔ تسلیم بھی بچپنے میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور انکی علیحدگی کے بعد اُن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی و عربی کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ رام پوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی[۱] کے اُستاد تھے اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں مشاہرۂ بیس روپیہ ماہوار ملازم تھے۔ شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرزِ دہلی کے تتبع پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

۱؎ راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفاضہ کیا ہے ۱۲ مترجم



حضرت [illegible]



منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیمِ دہلوی
مجھکو طرزِ شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب ان کی پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے۔ اُنھوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھکر مقبول الدولہ مرزا مہدی علیخاں قبول شاگرد ناسخ کی وساطت سے پیش کی۔ بادشاہ نے دیکھا اور اُسپر یہ حکم لکھا ؎

بشنوای خوشنویس و ای خوش گو
ہر دو فن مسکینی و ہر دو نکو
اِسمِ تو مندرج بہ دفتر شد
بست ودہ روپیہ مقرر شد

چنانچہ ان کا تیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے۔ بعد انتزاعِ سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک کوئی معقول ملازمت ملی اور نہ مقبول شعرا کے حلقے میں داخل ہو سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدۂ مدحیہ نواب کلب علیخاں کے حضور میں جو اُسوقت ولیعہد ریاست تھے پیش کرنے کا موقع ملا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوے اعزا سے ملے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نولکشور کے مشہور مطبع میں جسکو قائم ہوے اُسوقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا مصححوں میں ملازم ہو گئے جہاں اُنکے اُستاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لیے اُن کو دکھاتے تھے جب ۱۸۷۵ء میں نواب کلب علیخاں سریرآرائے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے۔

اور ابکی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھا دی گئی اور عہدۂ نظارت و بیشکاری سے ترقی کرکے وہاں کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ نواب صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور ٹونک ہوتے ہوئے منگرول پہونچے جہاں کچھ دنوں قیام کرکے نواب عالیشان نواب سید حامد علیخاں بہادر والی رامپور کے طلب فرمانے سے پھر رامپور آگئے اس مرتبہ نواب صاحب نے از راہِ قدردانی چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن مقرر کر دیے جو اُن کو آخر وقت تک ملتے رہے۔ تسلیم نے اِکانوے برس اس دُنیاے ناپائدار کی سیر کرکے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

**تصانیف** کہا جاتا ہے کہ اُن کا پہلا دیوان زمانۂ غدر میں ضائع ہوگیا۔ مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں :-

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اسمیں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور اُن کی دو مثنویاں بھی ہیں۔ (۲) "نظم دل افروز" مطبوعۂ رام پور۔ (۳) "دفتر خیال" ایضاً۔ چوتھا دیوان ناتمام سُنا جاتا ہے کہ اُن کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے۔ اِن کے علاوہ مثنویاں حسب ذیل ہیں :-

(۱) نالۂ تسلیم۔ (۲) شام غریباں (۳) صبح خنداں (۴) دل و جان (۵) نغمۂ بلبل۔ (۶) شوکت شاہجہانی (۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور

اِن کے علاوہ انھوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفرنامۂ یورپ منظوم لکھا ہے جسمیں تقریباً بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

**اندازِ کلام** کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زور دار ہے تمام اصناف سخن

یں مثنوی سب سے اچھی ہے اور اسمیں وہ اپنے ہمعصروں پر گوے سبقت لیگئے
ہیں۔اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں یعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے
ہیں غزلیں اکثر پُر معنی اور پُر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند"
ہماری رائے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔مگر پُر گوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی
کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے۔یعنی کلام کو پھیکا اور بیمزہ بنا دیا ہے۔تسلیم تین باتوں
کے واسطے مشہور ہیں۔اپنی غزلوں اور مثنوی کے لئے۔دوسرے مومن کے تتبع کے
واسطے تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی
کے وہ اُستاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبت وافلاس میں بسر کیا یہانتک کہ بعض
اوقات فقر وفاقہ کی نوبت آگئی۔اکثر اوقات ان کے احباب اور ان کے شاگرد
انکی اعانت کرتے تھے۔اُن کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی داستان تھی
جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔مگر مُفلسی اور پریشاں حالی نے اُن کے مزاج میں کسی قسم
کا چڑچڑا پن اور غم وغصہ پیدا نہیں کیا تھا۔بلکہ برعکس اسکے وہ نہایت ملنسار
اور قانع واقع ہوے تھے۔اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پر اُن کو رشک وحسد
کبھی نہیں ہوا۔تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

اُن کے شاگرد بکثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی۔عرش گیاوی۔
حاجی محمد اسمٰعیل خاں صبر معروف بہ بلبل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔
حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصۂ نثر میں لکھیں گے۔
چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کیے جاتے ہیں۔

…ے کہ تنگ ش میں گھبرائیگا ای دستِ جنوں — اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا
نالہ کھنچا ہے دل ہے خفا شوق ہے اُداس — تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
آبرو گر چاہتا ہے کنج خلوت کر قبول — قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہو گیا
عمر بھر رشکِ عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال — وہ ملا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا
قطرۂ خون بھی نہیں دل میں مرے — ہائے تر ہو گی زبانِ تیر کیا
کچھ کہدو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے — توڑو نہ آسرا دلِ اُمید وار کا
تسلیم کسکے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو — کیا اعتبار وعدۂ بے اعتبار کا
دل مرا تھا، گر گیا، گم ہو گیا، جاتا رہا — غم تمھیں کا ہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا
ڈھونڈھتا ہے روز و شب لیکر چراغ مہر و ماہ — کیا ترا اے آسمان پُر جفا جاتا رہا
مرقد میں سُفیدی جو کفن کی نظر آئی — سمجھا میں پس مرگ مرے ساتھ گڑی ہی ہوس
اور ہیں جنکو ہے شاگردی پہ اے تسلیم ناز — میں نسیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں
واعظ خدا شناس نہ ہوگا تمام عُمر — اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں
ایسا ستمِ چرخ سے اُف مُنھ سے نہ کرنا — یہ بات مرے دل میں ہے یا برگ حنا میں
ڈراتا کیوں ہے ای تسلیم واعظ مجھکو دوزخ سے — مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں
گردشِ بخت بہت دیکھ چکے اے تسلیم — چل کے میخانہ میں اب گوش ساغر دیکھو
کرتے ہیں سجدے اس لیے دیر و حرم میں ہم — کیا جانیے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو
طفلی سے جو بت شوخ ہو آفت کا بنا ہو — وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو
کعبے کا ارادہ کیے نکلے تو ہیں گھر سے — آجائے وہ بُت سامنے اسدم تو مزا ہو

**عرش** — ضمیر الدین عرش صوبۂ بہار سے تعلق رکھتے ہیں منشی بندہ علی کے ذیل گیا

کے صاحبزادہ ہیں ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انھوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم بہ "فکر عرش" داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شائع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم بہ "نظم نونگار" تسلیم کے رنگ میں اور انھیں کا اصلاح کردہ ہے اِن کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے۔ دو مختصر رسالے زبان اور فن عروض کے اور ایک تاریخ آگرہ و دہلی موسوم بہ "بارگاہ سلطانی" بھی انکی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار پنج کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

# دربار حیدرآباد

حیدرآباد دکن اپنی روایات علم وادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ نظام الملک آصفجاہ اول جس طرح شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے اسی طرح اُن کے مذاق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوے۔ حیدرآباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعرا اور اہل کمال کا ملجا و ماوا رہا ہے۔ فرمانروایان سلطنت اور امراے دولت کا آوازۂ سخاوت اور شہرۂ فیاضی سن سنکر شعرا۔ علما۔ فقہا۔ محدثین شمالی ہند اور نیز دور و دراز قطاع و ممالک مثلاً ایران۔ عربستان۔ بخارا۔ سمرقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے

بہرو مند ہوتے تھے۔ یہ باکمال لوگ افکار دنیاوی سے فارغ ہوکر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زیب و زینت سمجھے جاتے تھے۔ خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔ اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر پھر بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہوچکی تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اُس زمانہ کے دستور کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے۔ مگر زمانۂ حال میں اُردو کا چرچا زیادہ ہوگیا ہے جسکی تفصیل آئندہ سطور میں کیگئی ہے۔

**نظام الملک آصفجاہ اول**
**سنہ ۱۶۷۱ء تا سنہ ۱۷۴۸ء**

بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اول کا نام میر قمرالدین خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور دو دیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے ہیں "شاکر" تخلص کرتے اور مرزا عبدالقادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اُردو میں بھی کہا ہو مگر اُن کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

**میر محبوب علیخاں متخلص بہ آصف**
**سنہ ۱۸۶۶ء تا سنہ ۱۹۱۱ عیسوی**

ہز ہائنس مظفر الممالک فتح جنگ نواب میر محبوب علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۶ء مطابق ۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحاب ذیل کے سپرد ہوئی۔ مولوی محمد زماں خاں شہید، مولوی مسیح الزماں خاں۔ مولوی انوار اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین خوشنویس،



علیٰ حضرت نظام الملک نواب میر محبوب علی خان آصفجاہ
جنت آرام گاہ



ہز اکزالٹڈ ہائنس اعلیحضرت خسرو دکن خلداللہ ملکہ

مرزا نصر اسد خاں - مسٹر کلارک - سرور جنگ - افسر جنگ اور مٹھو خاں وغیرہ -
آپ کو زبان عربی و فارسی اُردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا۔ علوم مروجہ کے
علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے نشانہ بمثل لگاتے تھے آپ کے
علم و فن اور شعر و سخن کی قدردانی کیوجہ سے تمام علماء و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے
عہد کا مجمع دارالسلطنت حیدرآباد میں ہو گیا تھا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں
مولانا کرامت علی - مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام - مولوی امین الدین خاں
خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی - مولوی وحید الزماں خاں - مولوی مہدی علی
مولوی مشتاق حسین - مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی - مولوی نذیر احمد -
مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلّی
اور نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں اور حیدرآباد میں ہُن برسنے کا
شہرہ سُن سُن کر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی
کی بیّن مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت
واشاعت ہے جسکے واسطے اعلیٰ حضرت نے نہ صرف ایک زرِ کثیر مصنف کو عنایت
کیا بلکہ اسکے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کیواسطے مقرر کر دیا تھا۔
اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس
مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں - مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی
سوانحعمری نواب سرسالار جنگ بہادر - تاریخ دکن وغیرہ - اسی در دولت سے مولانا
شبلی نعمانی - مولانا حالی - مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی - قدر بلگرامی -
پنڈت رتن ناتھ سرشار - مولوی عبدالحلیم شرر - پروفیسر شہباز اور بیسیوں ایسے

کاملان فن برابر فیضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے
مشاغل علمیہ میں مصروف رہے۔ استاد شاہ بلبل ہندوستان نواب مرزا خان داغ کی شہرت
اور ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسّر
نہیں ہوا تھا مشہور ہے کہ آخر میں اُنکی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئے تھے۔
علاوہ اُن بیش بہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً فوقتاً اُن کو ملتے رہتے تھے۔
ہرچند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ اُن کی عمر نے وفا
نہیں کی مگر اُن کے صاحبزادے اختر مینائی اور اُن کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن
جلیل اب تک درباری شاعر ہیں۔ اور جلیل کو تو موجودہ حکمراں کی اُستادی کا فخر
حاصل ہے۔

میر محبوب علیخاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے اُستاد داغ کے متبع تھے۔
دو دیوان آپکی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حسن الفاظ کے ساتھ
حسن معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ نہایت سلیس فصیح اور بامحاورہ چپٹ پٹا کلام
ہوتا تھا اور محسن ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

**موجودہ فرمانروائے دکن** ہزاگزالٹڈ ہائنس اعلیحضرت سر عثمان علیخاں بہادر بجمیع القابہ
شعر و سخن میں اپنے پدر بزرگوار کے متبع ہیں آپ بھی نہ صرف قدردان و مربی فن بلکہ
بہت بڑے ناقد اور دلدادۂ سخن ہیں۔ آپ نے بھی اپنے دربار دُربار میں ایک مجمع شعرا
ادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام
جس سے کہ زبان اُردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اُسکو بے انتہا
استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی بیش بہا غیر زبانوں کی

کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئیں۔ آپ کے عہد ذریں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برآنہیں ہوسکتا۔ آپ عثمان تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ آپ حضرت جلیل سے استفادۂ سخن کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہز اگزالٹڈ ہائنس زبان فارسی عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

**مہاراجہ چندو لال شاداں**
**۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء**

امرا اور رؤسائے ریاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعرا اور اہل کمال کے جو مرتبہ مہاراجہ چندو لال کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکار ریاست یعنی وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ مہاراجہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہل کمال ہونے کے اہل کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جود و سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اُن کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدرآباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں اسقدر مشہور تھے کہ ریاست حیدرآباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدرآباد چندو لال کا حیدرآباد کہلاتا تھا۔ اُنکی سخاوت کا شہرہ سُن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعرا اور اہل کمال وہاں جمع ہوگئے تھے اور جو مشاعرے خود انھیں کے محل سرا میں ہر رات کو ہوتے تھے اُن میں یہ صاحبان فن جمع ہوکر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہوکر

واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کیئے گئے مگر حب وطن اور راہ کی تعب نے اُس طرف جانے سے اُن کو باز رکھا۔ مہاراجہ موصوف اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ چنانچہ دو دیوان اُردو اور ایک دیوان فارسی اُنکی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدرآباد میں جمع تھے۔ جنکی ماہوار تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی۔ ایک کتاب موسوم بہ عشرتکدۂ آفاق بھی اُنکی تصنیف ہے۔ اسمیں اُنھوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

**راجہ گردھاری پرشاد باقی**
**سنہ ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۹۰۰ء**

راجہ گردھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ نسبی دھر قوم کے سکسینہ کایستھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی مشاہیر حیدرآباد سے ہیں اور اِن کو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعرا کا شوق تھا۔ انھوں نے نواب مرزا خاں داغ کی جب وہ حیدرآباد گئے ہیں بڑی قدر اور مدد کی۔ اکثر کتابیں اُنکی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمۂ فارسی منظوم کیشونامہ کلیات باقی۔ قصائد باقی۔ پرنس نامہ۔ کنز التاریخ۔ بقاے باقی۔ سیاق باقی۔ پیرایۂ عروض۔ آئینۂ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُنکی رباعیات نہایت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ اِن کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمس الدین فیض کے شاگرد تھے۔

| | |
|---|---|
| مہاراجہ سرکشن پرشاد تخلص شاد<br>سنہ ولادت ۱۸۶۴ء عیسوی | مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم حیدرآباد زمانہ حال کے بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالر ہیں |

سلسلۂ خاندانی ایک نہایت قدیم اور معزز دلی کے خاندان سے ملتا ہے۔ جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے کسی کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا۔ اُن کے دادا مہاراجہ نرندر پرشاد اُس کونسل آف ریجنسی کے ایک رکن تھے جو جنت آشیاں میر محبوب علیخاں کے زمانۂ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ مہاراجہ چندولال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے اِن کو زبان عربی و فارسی میں بڑے قابل اُستادوں سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے انگریزی اور تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہونچائی۔ مہاراجہ صاحب موصوف عربی و فارسی و اُردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی نہایت دلکش ہوتا ہے۔ شاد تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علیخاں کے شاگرد ہیں جنھوں نے اِن کو "شاگرد خاص آصفجاہ" کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اُردو جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسی ادارت پر بھی چند روز آپ متمکن رہے۔ "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شایع ہونے کے لئے عطا فرماتے تھے۔ مہاراجہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا کلام مسائل تصوف سے لبریز ہے۔ اُن کے دیوان اُردو و فارسی شائع ہو چکے ہیں ایک دیوان معروف "بہ غمکدۂ رحمت" میں صرف نعتیہ اشعار ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہو کر آپ مذہب کو کس بلند نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کسقدر قائل ہیں۔ خاندانی

روایات بذل وعطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چندولال کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۴۰ تصانیف آپکی موجود ہیں جنمیں سے بعض کے یہ نام ہیں۔ بزم خیال (۳ جلدوں میں۔ رباعیات شاد۔ ہدیۂ شاد فریاد شاد۔ مطلع خورشید۔ ایمان شاد۔ خمار شاد۔ نغمۂ شاد۔ آرمغان وزارت مخزن القوافی۔ مثنوی آئینہ وجود۔ مثنوی سر وجود وغیرہ۔ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی اور عربی اشعار کا اردو شعر میں ترجمہ یا تضمین بہت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔ کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی عہدۂ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر" جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا ۱۹۰۱ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "یمین السلطنۃ" کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ عیسوی میں کے سی۔ آئی۔ ای۔ اور ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدان وزارت آپکو سپرد ہوا ہے۔

**انجمن ترقی اُردو** یہ مشہور و معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ چودہ برس سے قائم ہے جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر دلعزیز آنریری سکریٹری مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے سکریٹری صاحب موصوف کی ان تھک کوششوں اور چند لایق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت اور سب سے بڑھ کے اعلیحضرت فرمانروائے دکن کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ انجمن زبان اردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ زبان

انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہو گئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ تمدن۔ ایبٹ کی سوانحمری نپولین بوناپارٹ پلوٹارک کی سوانحمریاں حکمائے یونان وغیرہ کی۔ لیکی کی تاریخ اخلاق۔ اِن کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاق۔ اقتصادیات۔ تاریخ کی۔ خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شایع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اُردو کی اکثر پرانی کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اُسکو باقاعدہ اور سہل القرأۃ بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر برون کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سُنا ہو کہ ترجمہ ہو گئیں اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اُردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی کی بیش بہا تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کردیا گیا ہے اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہو گیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعوں اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کیگئی ہیں۔ آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اُردو ترجمہ کا حکم ہو گیا ہے اور اس کام کے لئے تقریباً بیس پچیس آدمی مقرر ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائیگی تو یقیناً مفید چیز ثابت ہو گی۔ سُنا گیا ہے کہ انجمن اُردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو اُن کے پڑھنے میں بہت آسانی ہو گی۔ مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ

زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہییں تاکہ جو کام شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمت انتظار نہ اُٹھانا پڑے۔ انجمن ر مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ "اُردو" جو زیرادارت سکرٹری صاحب موصوف نکلتا ہے ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے۔ اور اسمیں زبان اور ادب اُردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیرادارت ڈاکٹر مظفرالدین صاحب قریشی جاری کیا ہے جسمیں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں۔ یہ بھی مثل "اُردو" کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاءاللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہونگی۔

**عثمانیہ یونیورسٹی** "عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روزافزوں علمی وادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصۂ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت بےچینی سے انتظار کر رہے تھے" عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہائے علوم کی تعلیم زبان اُردو میں ہوتی ہے انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبجکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلبا اس زبان سے بھی ناآشنا اور انگریزی بولنے والی دُنیا کے حالات و خیالات سے بےخبر نہ رہیں۔ ابتک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلبا کی تعداد برابر



مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم مدارالمہام ریاست نظام

بڑھتی جاتی ہے۔گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کرلی ہے اور اُس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اُسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہائے الٰہیات (تھیالوجی) علوم وفنون (سائنس وآرٹس) اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

**دارالترجمہ** عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنیکی غرض سے دارالتصنیف والترجمہ قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیرنگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے۔ ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اسکی قابل قدر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہوگئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں۔ اس میں آٹھ قابل مترجم زیرنگرانی ایک افسراعلیٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنف ہیں، کام کرتے ہیں دارالترجمہ کی خدمات قابل تحسین وآفریں ہیں۔خاص کر جب ہم اُن دقتوں کا خیال کرتے ہیں جو علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اُردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہران فن کی کمیٹیاں قائم کیگئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ واصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شائع ہوگئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہز اگزالٹڈ ہائنس نے اسکی عمر میں دس برس کی اور توسیع کردی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں

علاوہ مکمل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف و تراجم داخل ہین تاریخ (جسمیں مشرقی اور مغربی اور قدیم وجدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے) فلسفہ اقتصادیات ۔ ریاضی (خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات ۔ کیمیا اور قانون ۔ جب فن تعلیم و انجنیری اور طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنون کی کتابیں بھی ترجمہ کیجائینگی جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے ۔ مصنفہ اور مترجم کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شائع ہوچکی ہیں ۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں ۔ مختصر یہ کہ دار الترجمہ زبان اُردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے ۔ اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے ۔



# باب ۱۴

## اُردو شاعری کا جدید رنگ

### آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو

اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اُس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانۂ مابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہونیوالی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے۔ اور شاعری میں اصلاح کا رُخ دکھا دیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبیاری بعد کے آنے والوں نے کی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظر قدرت، واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا من وعن اظہار، نصائح آموزی کیفیات قلبیہ کا اظہار الفاظ میں سلاست و روانی، تشبیہ و استعارے کا حد سے متجاوز نہ ہونا یہ سب باتیں جو زمانۂ حال کی شاعری کی جان ہیں پُرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں اس آنیوالے انقلاب کی خبر دیدی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروع و تمہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں

وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ کے اختیار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو بگڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو طرز قدیم کے دلدادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے اُن کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش و خراش کی اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حسن ظاہر کو دیکھتے تھے اس وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور نیچرل کلام اُن کو پسند نہیں آیا۔ اِن پُرانے خیالات کو محو کرنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جسکی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

**انقلاب کا اثر** انقلاب زمانہ اُردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا دلّی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعرا کے سرپرست اُٹھ گئے۔ اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جنکی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمرا کے شعرا کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رام پور و حیدرآباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصۂ دراز تک اُن کے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے اُمرا کو صرف دولت کے

اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کے مالی نفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے تھے جنکی دنیا میں نثر کی صاف اور سادی صبح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے۔ اب وہ پرانے رنگ کے تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک مقبول ہے۔ دہلی کی تباہی انتزاع ملک اودھ غدر ۱۸۵۷ء اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی میں مبتلا ہو گئے۔ ہندوستانی ریاستیں گو ان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتار زمانہ کے موافق اُن کو بھی اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضرور تھی۔ اس وجہ سے وہ ریاستیں جو شعرا کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جسکا اثر شعرا کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

**انگریزی تعلیم کا اثر** انگریزی تعلیم سے بھی اُردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور انکو بڑی تقویت پہونچی۔ انگریزی تعلیم نے زبان اُردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ ریناسانس[1] نے سولھویں صدی میں اور رومانس (افسانہ نگاری) کے شوق نے اٹھارھویں صدی میں کیا تھا۔ ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جسمیں نظم نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اُردو زبان کے

---

[1] نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنون لطیفہ بلکہ جمیع مروجہ علوم و فنون کا قرون وسطی کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز اختیار کرنا ۱۲

اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبان انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے اُن تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کے ایما سے کرائے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے اور اُنھوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں زمانۂ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں بدل ڈالیں اور اُس میں ایک جدّت کی چاشنی پیدا کریں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعۃً نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پُرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نماؤں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب واحترام اور نیز اُن کے رنگ کی مدح سرائی اور قدردانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی مولانا حالی کی ”یادگار غالب“۔ اور آزاد کا مطبوعہ ”دیوان ذوق“۔ ہمارے اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے۔ اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہوجائے کہ اُس میں جدید رنگ بھی شامل ہوکر اُس سے پُرانے رنگ کا تصنع اور تکلف جاتا رہے یعنی فضول مبالغے، دور از کار تشبیہیں، بے مزہ لفاظی ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور اُنکی اصلاح کی بنیاد انھیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

**جدید رنگ کی خصوصیات**

جوں جوں جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اسی قدر وہ مقبول ہوا اور اُسکے معرف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے

بالکل نا آشنا تھی اُس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سجکٹ اور مضامین تلاش کیے گئے۔ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ اور بے مناسب پایا گیا۔ مسدس اور مثنوی کا دور دورہ ہوا کیونکہ ان اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مسلسل کیا جاسکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے۔ ایسے مضامین جنکی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کئے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ لیگئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور اُن پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا۔ مثلاً برکھا رُت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریا کی روانی، پہاڑوں کے خوشنما مناظر، اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پولیٹکل نظمیں، اشعار بصورت سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پُرانے فرسودہ مضامین زلف کا کل کنگھی، چوٹی، مسّی کاجل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے، اب جذبات انسانی، اور کیفیات قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتی دُنیا وغیرہ کا نہایت پر اثر الفاظ میں بیان کیا جانا داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

**اصنافِ سخن میں جدتیں** ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی

پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اُردو میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اُس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبان اُردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک ورس (نثر مرجز) کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اُردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کہنہ مشق استادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی مولانا شرر مرحوم، آزاد کاکوروی وغیرہ۔ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں۔ مگر اُن کو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدّت کی ہے کہ ہندی دوہروں کی پیروی اُردو نظم میں شروع کردی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بُھلا دیے گئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیے کے واسطے مخصوص ہو گئی تھی مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب "مدوجزر اسلام" معروف بہ مسدس حالی لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنف خاص کا بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اسقدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نیچرل، بیانیہ، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے، تاریخی نظمیں، سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ اور اسکی وجہ ظاہر ہے۔ اسکی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلۂ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لطف اور ترنم

پڑھا جاتا ہے۔ مسدس کے علاوہ اور اصناف نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے نفس شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کردی گئی ہیں۔ اور اب سادگی صفائی اور واقعیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانۂ موجودہ کی نظمیں بہت مؤثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

**جدید رنگ کے اثرات** انگریزی طرز تعلیم نے اُس عام افسردگی کو دور کردیا جو آخر آخر میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری پر چھا گئی تھی۔ اُس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ نثر کی ترقی اور جدید فن تنقید اور ڈراما کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اُسکی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرۂ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامانِ زینت فراہم ہوے۔ نئے نئے مضمون اور خیال ہاتھ آئے۔ اور اُن خیالات کے اظہار کے لئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اُسکی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوے اور زبان اس قابل ہوگئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کرسکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اُردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ اُن کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ اُن کا مطمح نظر محدود ہوگیا تھا اور اُنکی ذہانت و طباعی زنگ خوردہ ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اُسکی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہوگئی۔ اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں، اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں اُن کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اسلئے اِن میں اتنا تغیر عظیم

پیدا کر دیا ہے کہ زمانۂ حال کی تصانیف اُن زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپروائی۔ ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت دفع ہو جائینگی۔

جدید ادب اردو کے تین طرز - پہلا طبقہ

پہلا طرز اُن لوگوں کا ہے جو پس پشت دیکھنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانۂ موجودہ کے گزشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ اِن کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جسمیں کچھ فلسفہ کچھ تصوف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انھیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ ہوتا تو البتہ معذور تھے۔ مگر بغیر کسی تعلق کے یہ یا تو قدما کے محض نقّال کہے جا سکتے ہیں یا لفاظی کے شعبدہ باز۔ پرانے مضامین کے ساتھ پرانی بحریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی اُن کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر انگریزی شاعر پوپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اُن کے باپ بھی شعر کہتے تھے۔ اور اپنی"

عدمِ ذہانت سے اپنی ناخلفی کا اظہار کرتے ہیں"۔
ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقال کہے جا سکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آجکل کے رسالے اور گلدستے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیروی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعتدار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرضکہ طرزِ قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیرو زمانۂ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اگر زمانۂ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی کوششوں سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

**دوسرا طبقہ** یہ طبقہ طبقۂ اول کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ اپنے ملک کی پرانی روایات کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسبِ حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے اُن لوگوں کے دماغوں کو چکرا دیا اور اتنا مدہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پُرانے زمانے سے اور پُرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا اُن کو بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ

اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اُن کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالاتِ ملکی کے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے۔ وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدۂ عوام ہیں مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم۔ اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے۔ بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرزِ تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو انگریز جورنلیس، کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی ناقص اور ناکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حال عام طور پر اُن کرایہ کے ٹٹو ناول نویسوں کا ہے جنکی لغو اور مضر تصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے پرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرزِ ادا ناکمل ہو۔ رنگ فوق البھڑک ہو۔ اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ بدنمائی کو خوبصورتی پر۔ بھدے پن کو حُسن تناسب پر۔ اور شور و غل کو نغمے پر ہرگز ترجیح نہ دیں۔

**تیسرا طبقہ** یہ اُن اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گو زمانۂ موجودہ میں ہیں مگر زمانۂ گذشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ یہ روایاتِ قدیمہ کو

بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان میں اوریجیلٹی یعنی اصلیت ہے۔ انکی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق جیسن کی تھی جو ایک سنہری بھیڑی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اُسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب و شاعری کی سیر کرتے ہیں۔ اِن کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیے جو ایک ملک میں مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ ڈالتا ہے۔ بلکہ یہ راس المال شاعری کے صناع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور ان سے نئی نئی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں یہ اپنے شعروں سے اپنے اور نیز اپنی قوم کے دل و دماغ کیواسطے غذائے روحانی تیار کرتے ہیں یہ زمانۂ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانۂ آیندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اِسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا اور شاعروں کو داخل سمجھنا چاہیے مثلاً حالی، آزاد، شرر، سرشار، سرور، مولوی محمد سماعیل، اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔ اِن حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کر لیا ہے اور انھیں پر آیندہ ترقی کی اُمیدوں کا دارومدار ہے۔

**حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء**

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہونچتا ہے جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے

اور بزمانۂ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ گانوں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر کردیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جب اُن کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ اُن کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا اُنکی تعلیم و تربیت کا بار اُنکے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد اُنھوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میر ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو نہیں پہونچے تھے کہ ان کی شادی اِن کی مرضی کے خلاف کردی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبر گیران خوشحال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں دلّی چلے گئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف نحو، منطق، عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہوگئی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزا کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کرلی مگر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اِنکی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں۔ غرض کہ

تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد ان سے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہوگئی اور نیز انکی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھلایا اور اُن سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اسمیں کوئی شک نہیں جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہونچا۔ اُن کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفاضۂ سخن کرتے تھے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مُقلد ہوں میر کا

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت، وہاں کی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پُرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس بغرض اصلاح دلی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلم کے تقریباً آٹھ برس رہے۔ اسکے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اِس وقت دلی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں اُن کو گورنمنٹ بکڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں اُن کو سررشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اس کام میں انگریزی ادب ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہوگئی اور انگریزی خیالات و طرز ادا سے

ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی لہذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشا پردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہوگئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اُسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہونگے کہ وہاں سے دلی واپس آنا پڑا جہاں اُن کو انگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مِل گئی۔ لاہور میں جنھیں کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچر رہ چکے تھے مگر وہ جگہ اُن کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلی میں سرسید مرحوم سے اُن سے ملاقات ہوئی جنکی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدس حالی" لکھا ۱۸۸۶ء میں جبکہ وہ عربی کالج میں معلّم تھے سر آسماں جاہ علی گڈھ آئے ہوئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُن کا تعارف کرا دیا اور اُنھوں نے ازراہ قدردانی و مردم شناسی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے اُن کا مقرر کرا دیا۔ بعد کو جبکہ مولانا حالی علیگڈھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے سنہ ۱۹۰۴ء میں خطاب شمس العلما بجلدوے اُنکی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستتر برس کی طویل عمر میں ۱۲ صفر سنہ ۱۳۳۳ھ مطابق سنہ ۱۹۱۴ء کو اِس دار ناپائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پُرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال اُن کے

دل میں مطلق نہ تھا۔ اُن کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی اُن میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی مگر اُس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ اُن کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ہ کے وہ پورے عامل تھے۔

**حالی کی شاعری اور اُس پر غالب اور شیفتہ کا اثر**

حالی کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی جبکہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور اُنہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکاتِ شعریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی اُن سے بہت خوش تھے اور اُنکی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے۔ دلی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں اُنکی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی نواب صاحب کی صحبت اُنکی شعرگوئی کی محرک ہوتی تھی اور یہیں اُنھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا۔ اب اُن کو پُرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا مِن و عن بیان سیدھے سادے الفاظ میں جسمیں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو، اب اُن کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور اُنھیں کا رنگ اُن پر غالب تھا ہرچند کہ شیفتہ کا اثر اور رنگ اُن کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آگئے مگر یہاں اُن کا دل نہیں لگتا تھا اور

یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو اُنھوں نے قلمبند کیا ہے اس سے اُن کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت میں اُن کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔ یہ زمانہ انکی علمی زندگی کے رُخ بدلجانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اُس جدید رنگ کی ابتدا نجوبی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور اُسکی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُن کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں ایک ادبی انجمن قائم تھی جسکے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم پنجاب اُسکے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے یعنی نہ تو کوئی مصرعۂ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کیجاتی۔ لوگ اپنے اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے، جو انجمن کیطرف سے پہلے سے مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالی گو کہ اِس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اسکے ابتدائی شرکا میں ضرور تھے اور اسکے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ اُن کی چار نظمیں "برکھا رت۔ نشاط اُمید۔ مناظرۂ رحم و انصاف اور حب وطن"، اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت

مقبول ہوئی تھیں ۔

سرسید کا اثر

غالب اور شیفتہ کا اثر اُن کی شاعری پر سطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا چاہیے کہ سرسید مرحوم نے اُن کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سرسید اِس زمانہ میں مسلمانوں کو اُن کے خواب غفلت سے چونکانے اور اُنکی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ جب اُنھوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھدو۔ مسدس حالی اِسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبول عام ہوگئی۔ اُن کا رنگ اسقدر مقبول ہوا کہ اُس کے بہت سے ناقل پیدا ہوگئے مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جسکے وہ فی الواقع مستحق تھے۔ اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوے۔ مسدس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خانصاحب کا مرثیہ جسمیں مسلمانوں کی زمانۂ گزشتہ کی عظمت اور زمانۂ موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اِسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے اُن کی شہرت ایک ریفارمر اور خطیب کی ہوگئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پُرزور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے اُبھارتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمرہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہوسکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہوگا کہ اُن کے مخاطب اُن کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنے اہل ہند تھے۔ اُن کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" کی صورت میں ظاہر ہوے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں

آخر عمر میں اُن کے اشعار فلسفیانہ اور عمیق ہوتے تھے جیسا کہ اُن کے ترکیب بند "تحفۃ الاخوان" سے ظاہر ہے۔

تصانیف — مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ اُن کی نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائینگی :-

(۱) مثنویاں۔ مناظرۂ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھا رت۔ نشاط امید۔ حُبِّ وطن۔ (۲) مسدس حالی۔ (۳) شکوۂ ہند۔ (۴) کُلیات حالی جسمیں اُن کا دیوان معہ مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہوا ہے۔ (۵) مناجات بیوہ، اور چُپ کی داد۔ (۶) مراثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعۂ نظم حالی جسمیں اُردو کی متفرق نظمیں ہیں۔ (۸) مجموعۂ نظم فارسی۔ جسمیں فارسی کا کلام ہے۔

مثنویاں — انکی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغے اور صنائع بدائع سے خالی ہے۔ ان میں اخلاقی تعلیم نہایت مؤثر اور دلفریب انداز سے دیگئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جسمیں ہر فریق کی اچھائیاں اور بُرائیاں نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کیگئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اِن کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ مثنوی برکھا رُت بھی نہایت عُمدہ اور دلچسپ مثنوی ہے

اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دلفریبی سے
بیان کیا گیا ہے مثلاً بارش کے فائدے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرش زمرد یں کا
بچھ جانا۔ کل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور اُمنگ کا پیدا ہونا
وغیرہ۔ اِس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت نیچرل ہے۔ فضول مبالغے
اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے اسمیں مطلق نہیں۔ یہ اُس رنگ کی ابتدائی تصنیف
ہے جسمیں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا۔ البتہ اگر پرانے شعراء کے نقطۂ نظر سے
دیکھا جائے تو یہ نظمیں بلحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔
مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں
لوگوں کے اب یہ دلنشین ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے
کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

**مسدس حالی** مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف
ہے۔ یہ ایک نیا دَور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اسکی مقبولیت اب بھی ویسی ہی
ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اسکو تاریخ ارتقاء ادب اُردو
میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اُردو کے اُفق شاعری پر
طلوع ہوا۔ اِس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اِسنے
یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پُر اثر اور پُر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز
ہے۔ اسکے بہت سے نقّال پیدا ہوے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور
تخئیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہونچا، اسمیں اسلام کی گذشتہ عظمت، مسلمانان
سابق کے کارنامے، اُن کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے

زمانۂ موجودہ میں اُنکی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کیگئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اُس کو حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے جوان۔ بچے سب کے دلپسند ہے اس نے کاروان مسلم کے لئے بانگ جرس کا کام کیا کہ اُٹھیں اور آمادۂ کار ہوں۔ طبع ہوتے ہی اسکی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانۂ حال کی کوئی اُردو کی کتاب مقبولیت میں اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانۂ گزشتہ کی اور برائیاں زمانۂ موجودہ کی۔ اسمیں شاعر زمانۂ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نمائے عرب کی تمام متمدن دنیا سے انقطاعی صورت، عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا۔ اُن کا تعصب اور ناروا داری، اُن کا طغیان و بُت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھاتا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات۔ اعلائے کلمۂ حق۔ توسیع علوم۔ استیصال ظلم و تعصب اصلاح اخلاق اور اُن تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے آجکل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جنکی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ اسمیں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو اُس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دُنیا میں کی ہیں۔ پھر مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جسمیں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے دلچسپ

نکل کر دور و دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہونچ گئے ۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر | | نشان اُن کے باقی ہیں جبرالٹر پر | |

سر سید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں :-

"یہ کہنا بالکل مُناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اسکی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جسقدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اسقدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اسقدر مُوثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اُس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھکر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے"

**شکوۂ ہند** شکوۂ ہند[له] اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدس مدوجزر اسلام کے طرز میں ہیں یعنی انمیں بھی وہی بیان اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی نکبت کا ہے جواب ہندوستان میں رُونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزہ داری، سادگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بُوداپن، چالاکی و مستعدی کے

له ۔ اس کا جواب بیان یزدانی نے "رخصت عروس" کے نام سے لکھا ہے۔ جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اُس نے ہمکو خراب کیا اُسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲

بد سے سستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اِس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہوگیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی | مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ مؤثر اور قابل قدر نظمیں ہیں۔ اوّل الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پُر زور مرثیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم متشکل بہ نظم ہوگیا ہے۔ وہ سچے جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے سادگی یعنی شائبۂ اغراق و مبالغہ سے اُس کا معرّا ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے اُسکا نشانِ امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدس اور شکوہ کا رنگ ہے۔ اس میں دلّی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذِکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

مناجات بیوہ | یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک "مسدس اور شکوہ" سے بھی زیادہ مطبوعِ خلائق ہے اسکی بحر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح علم عروض میں "صوت الناقوس" کہلاتی ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔ سوشل معاملات کی اصلاح کی ہوا اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال میں ودیا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے "مناجات بیوہ" میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت اس انداز سے بیان کیگئی ہے کہ اس کو پڑھکر یا سُن کر دل پھٹ جاتا ہے۔ اِسکا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہوگیا ہے

اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہردار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لُطف اندوز ہوتے - اسکی تعریف اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے -

چُپ کی داد

اِس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز اُن کے اعلیٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے - یہ حیدرآباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جسکے صدر مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے، پڑھکر سُنائی تھی - یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اسمیں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو اُن کا خاص شیوہ ہے - ان تمام نظمونکی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مُصنّف مُرتفع ہیں -

دیوان حالی

اِس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جسمیں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کیگئی ہے - دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی، رباعیات، قصائد، ترکیب بند، تاریخیں سب کچھ ہیں قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں - بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں - غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ ہیں - اور مغلق و پیچیدہ خیالات سے خالی ہیں - طرز جدید کی غزلوں میں پُرانا رنگ بدل کر زمانہ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے - یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے - رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں - اُن میں مفید اور کار آمد باتیں مؤثر اور زوردار الفاظ میں

قدما کے طرز پر بیان کیگئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی۔ای۔ وارڈ نے کردیا ہے۔ قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقۂ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان وشکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت وعبرت کی باتیں بھی اُسکو سُنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

**مقدمۂ شعر و شاعری** اس میں نفس شعر وشاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ آئیڈیل یعنی منتہائے مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گوکہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے۔ لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں لہٰذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ غزل میں مروجہ بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اُس کو اُس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جسمیں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اِسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں ہیں[۱]

[۱] افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھدیا کہ شیخ و زاہد پہ جو پھبتیاں کسنے اور اُن کو بنانے کا اُردو شاعری میں عام رواج ہوگیا ہے اُس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیئے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت[۱] (باقی صفحہ آئندہ)

**دائرۂ غزل کو وسیع ہونا چاہیے اور اُسمیں نہ صرف عاشقانہ فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہوں بلکہ ان کے علاوہ اُسمیں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں**

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ (۴۸۶)

واعظ اور زاہد کے استاڈرنے اوران پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے اُسکا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے ورنہ بالکل بیکار ہے اور اُسکو ترک کر دینا چاہیئے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی اُنھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع اُس جماعت سے کسی قسم کی مخالفت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہو تو یہ طنز و تشنیع ایسے طریقہ سے کیجائے جس سے مقصود اصلی اُن معائب کا اظہار ہو جو اُس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں مثلاً ریا۔ مکر۔ سالوس۔ خشونت۔ درشتی۔ بدخلقی وغیرہ نہ یہ کہ اُنکی ذات پر بلا وجہ حملہ کیا جائے یا اُنکی پستی میں اپنی بلندی ثابت کیجائے۔ مولانا حالی نے اس مجوزۂ نظریہ کے ثبوت میں ذوق کے دو شعر پیش کیے ہیں ؎

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| | رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو | | تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو | |

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اُس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقۂ زہاد و عباد میں اکثر پائی جاتی ہے کہ اوروں کو تو ذرا ذرا سی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بیخبر ہیں۔ لہذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے ؎

| | | | |
|---|---|---|---|
| ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر | | وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے | |

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے سوائے اسکے کہ بیچارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اُسکو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔
اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس مبحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ کون سا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کسکی ممانعت ہے۔ (باقی اشعار متعلق مضمون ہٰذا صفحہ ۴۸۸)

درستی زبان بھی بہت ضروری شے ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنائع بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہیے اور نہ شعر کی خوبی کا دارومدار اُن پر رکھا جائے سنگلاخ زمینیں اور مشکل ردیف قافیے جن کے مصحفی اور شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے اُن سے احتراز کرنا چاہیے۔ حتی الامکان ردیف بھی اُڑا دی جائے[ل۵]۔

اولیات حالی | حالی کا مرتبہ ادب اُردو میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۴۸۷

شیخ صاحب بُرائیاں مے کی
اِک میٹھی سی تھی حضرتِ زاہد کو ای ریاضؔ
کسی میکش کو دینگے تحفۂ انگور کی خدمت
مے بہ بنہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
دیکھنا تلخ سرِ شیخِ منعم کی طرف
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
کب کسی در پہ جبہ سائی کی

اور جو کوئی چھیٹ کی آجائے (ریاضؔ)
اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں "
جناب شیخ ٹھیکہ لیچکے ہیں باغ رضواں کا (راسخؔ)
پیش ایں قوم بشورابۂ زمزم نہ رسد (غالبؔ)
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
شیخ صاحب نماز کیا جانیں (داغؔ)

ل۵۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے! بلکہ اُن کا منشا یہ ہے کہ غزل گوئی میں جہاں تک ممکن ہو آسانی مدِ نظر رکھی جائے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں "کہ شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونوں ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہییں اور سردست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے" ۱۲

انھی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں موثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنے مادر ہند پر نظمیں لکھیں۔ طرز قدیم پر کہ جسمیں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔ ہمواری خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا۔ سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کیے۔

آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اُردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ نیچر کی پیروی۔ مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی۔ جذبات اور درد و اثر۔ انکی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔ صنائع بدائع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضول تعلّی اور بیجا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

**نقائص حالی** وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے تمیز ہو۔ کبھی اُنکا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تُک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ایک رفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی اُن کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا اِس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی اُن کا کلام لاجواب ہے اور اُن کا یہ احسان کبھی نہ بھولیگا

کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو ایک بڑی حد تک اُن مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا جو اُسمیں سرایت کیے ہوے تھیں اور اُس میں ایک نئی روح پھونکی مختصراً یہ کہ ہر چند وہ شعرائے اردو کی صف اولین میں شامل نہ بھی کیے جائیں مگر ادب اُردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کیے جائینگے۔

مولانا محمد حسین آزاد

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اُردو کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانۂ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نثار، نامی گرامی نقاد فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے علاوہ وہ جدید فارسی کے اُستاد کامل اور فلالوجی (علم الالسنہ) کے بھی بڑے ماہر تھے اُنکی خدمات اور احسانات زبان اُردو پر بیحد ہیں اُردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اسمیں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جاسکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے اُن کے کچھ مختصر حالات آیندہ حصۂ نثر میں بھی بیان کیے جائینگے جس سے اُن کا حقیقی تعلق ہے۔ یہاں اُنکی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آزاد کی شاعری

آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی نثر بھی اسقدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے اُن کے والد چونکہ اُستاد ذوق کے دوست تھے اور اُنکی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے تھے لہذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ اُستاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور اُنکی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ اُنھیں کی معیت میں دلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذۂ فن سے شناسائی کے علاوہ اُن کے کلام کے



خواجه الطاف حسین حالي



مولوی محمد اسمعیل میرٹھی

حُسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ اُستاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حُسنِ عقیدت تھی اور اُنھیں کے فیضِ صحبت اور حسنِ تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دل میں جذبۂ شاعری پیدا ہوگیا۔ دِلی کی آخری عظمت و شان کی یادگار زوالی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے اُن مجمعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ اِدھر اُدھر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہوگئے۔ چونکہ لاہور دلی سے قریب تھا اس وجہ سے دلی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے۔ اِنھی لوگوں میں محمد حسین آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال، پنڈت من پھول میر منشی، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ حسن اتفاق سے پنجاب میں اسوقت کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبان فارسی اور اُردو پر عبور رکھنے کے زبان اُردو کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے۔ انہیں کے ایما سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جسکے جلسے اُسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اُردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیے جائیں، نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعۂ طرح دینے کا مروّج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعراء خاص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار اور آمادہ کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ یہ جدید رنگ عنقریب مقبولِ عام ہو جائے گا۔

اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اسکی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی دکھا دیں جو بالفعل پرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۸۷۴ء میں جو ایڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے پڑھا تھا اسمیں اردو شاعری کے عیوب تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنع اور خلاف فطرت رنگ۔ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بہ وضاحت بیان کر دیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہمکو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں۔ اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانہ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کرو۔ سادگی، اظہار اصلیت اور درد و اثر بھاشا سے اوصاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

**تصانیف منظوم**

آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اس پر خود عمل بھی کیا۔ انھوں نے اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ استاد ذوق کی صحبت نے ان کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا استاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں سنانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد ان کو ریاست جیند میں ایک جگہ مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں، قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے ہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام ان کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے ۱۸۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء عیسوی میں

اُس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جسکا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں اُنھوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جسمیں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے۔ پُرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی اُمنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اُردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً اُن کی نظم "اولوالعزمی کے لئے کوئی سد راہ نہیں"، انگریزی شاعر ٹنی سن کی نظم "اکسلسیر" کے انداز پر ہے مگر اُس کا ترجمہ ہر گز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی شرافت حقیقی۔ معرفت الٰہی۔ سلام علیک جیسے چاہو سمجھ لو۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارکباد جشن جوبلی۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعۂ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

**آزاد کا قدیم و جدید رنگ** قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اُسی پُرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعۂ نظم آزاد کے آخر میں اُن کے پُرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ زوردار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو ان کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں (۱) مثنوی شب قدر۔ یہ اُن کا شاہ کار ہے اور اسمیں مختلف لوگوں کے اشغال شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے

بیان کیے ہیں- طالبعلم- مہاجن اور چور کی کیفیت. علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہے -

## طالبعلم

ہیں مدرسہ کے طالبعلم اپنے حال میں
کل صبح امتحاں ہے سو اسکے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپسمیں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

## مہاجن

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بجی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوے
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیے ہوے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

## چور

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
دزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اُسکے ہر اک اینٹ داں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چھپکے چھپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائےگا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کسنے ہے اور کون اڑائے گا

## شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے  
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے

ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے  
اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے

لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر  
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے  
ہو جاتے ہیں وہی دُدِ مضموں نئے نئے

مضمون تازہ گر کوئی اس آن مِل گیا  
یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مِل گیا

اِس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے  
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے

مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل کے ہے  
لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اُسکی کرتے ہیں جو شعر سُنتے ہیں  
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دُھنتے ہیں

## اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں  
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہے  
اور کرتا صدق دِل سے دعا بار بار ہے

مجھکو تو ملک سے ہے نہ ہی مال سے غرض  
رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے  
وہ بات دے زباں پہ کہ دِلمیں اثر کرے

جاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں ۔۔۔ کرتا ہے اُسکو خرچ عدو کے علاج میں
رجاتا صاف دشمن بدمیں یہ چوٹ ہے ۔۔۔ اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے ۔۔۔ اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

(۲) مثنوی حُب وطن اسمیں اُنھوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جسمیں یہ دکھلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورتمیں ہو سکتی ہیں

(۴) مثنوی ابر کرم اسمیں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے یہ حالی کی برکھارُت کے طرز پر ہے۔

(۵) صبح امید۔ اسمیں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاربار عالم مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام کرتی ہے اور کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔

**آزاد و حالی کا فرق** آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ اُن کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک وصاف نہیں۔ حالی سر سید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوے اور تنزل اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پُرجوش کلام کی لے میں الاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اُن کی اُفتاد طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے اُنھوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کر کے اپنے میلان طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور اثنائے نفس سے

کام لیکر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے مختصر مجموعۂ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح وبہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جسقدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ اُنکی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف اُن پر شعریت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

**مولوی محمد اسماعیل میرٹھی** مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲۔ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے میرٹھ وطن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کرکے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے جہاں بارہ برس تک قیام کرکے ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ بعد پنشن اپنے وطن مالوف یعنی میرٹھ واپس آئے اور یہیں قیام اختیار کرکے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی اُنکی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب "خاں صاحب" بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اس دُنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی وہ اردو ریڈریں اور پرائمریں تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصۂ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور اُن کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ اس مُعاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبۂ پنجاب کیواسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں اُن سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں

سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں - بلکہ سچ پوچھیے تو ان کا جواب سررشتۂ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔

مولوی صاحب شاعر اور نثار دونوں تھے۔ اُن کا خاص رنگ اِن دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جسکے وہ اُستاد کامل تھے شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرضکہ ہر قسم کی نظمیں انکی لکھی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا اور اُسمیں اُنکی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طباعی اور قادر الکلامی اُن کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے۔ اُن کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانۂ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں - اُردو میں بلینک ورس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا شعر مرجز میں بھی اُنھوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے۔ علاوہ غزلیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں۔ اُنھوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصّے کہانی کے طرز پر مثل "ایساپس فیبلس"، کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتایج اخذ کیے جاسکتے ہیں

قلعۂ آگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائے ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ اُن کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں۔ چنانچہ اُن کے مسودات محفوظ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہوں گے۔ آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور اُنکی سوانحعمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قران السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اِس کام کو رُوک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ ادبِ اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بھی پُورا نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرزِ قدیم وجدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

**سُرور جہاں آبادی** منشی دُرگا سہائے سرور کو بھی اُردو شاعری کے طرزِ جدید کا ایک رُکن رکین سمجھنا چاہیے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی۔ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ ان کا عمل "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر تھا۔ یعنی پُرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عُمدہ اور قابل قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حُبّ الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانۂ حال کی معمولی بے لُطف باتوں اور زمانۂ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے

لام پاک ہے۔شستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی
ا ہوئی ہے۔

سُرور کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا بلکہ اُن کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ اُن کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا اُن کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے۔جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا۔سرور بھی نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے۔فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔مگر یہ عسرت و مصیبت اُن کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیما نہ کرسکی۔وہ مذہبی تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔نہ اُن کو نمائش اور ظاہرداری کا شوق تھا۔بلکہ اُن کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی۔اُنیں دنیا کا مکروفریب مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب اُن میں تھے وہ بھی ہنر معلوم ہوتے تھے۔سب سے بڑا عیب اُن میں مے نوشی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح اُن کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین ہوتی تھی۔گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کمبخت عادت کی بدولت اُنکی ہونہار اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہوگیا۔صرف بعمر ۳۰ سال ۱۹۱۰ء میں اُنھوں نے انتقال کیا۔

**ان کی شاعری کے خصوصیات**

(۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔مثل استاد الشعرا میر تقی میر کے سُرور کے مزاج میں بھی حزن و یاس اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اسی وجہ سے مثل میر کے اُنکا کلام بھی جذبات نگاری کا



حضرت زور تہا آبادی



منشي نوبت راے نظر

ایک مرقع ہوتا تھا۔ اُن کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں :۔ دیوارِ کہن، حسرت شباب اندوہ غربت :۔ مرغان قفس، یاد طفلی :۔ بلبل کا فسانہ ۔ حسرت دیدار۔ ماتم آرزو وغیرہ

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے ۔ بلکہ اُن کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجا ہے ۔ اُن کے مخاطب صرف اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پبلک ہے ۔ اس قسم کی اُنکی نظمیں یہ ہیں ۔ خاک وطن ۔ عروس حُب وطن ۔ حسرت وطن ۔ یاد وطن ۔ مادر ہند وغیرہ ۔ یہ مادر ہند بابو بنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے ۔ ان تمام نظموں میں حب وطن کا سچا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں ۔ ان کے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فسانۂ گل و بلبل ۔ شمع و پروانہ وغیرہ ۔

(۳) اس کے بعد اِن کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے ۔ اِن میں بھی صحیح جذبات، صداقت، فصاحت ۔ بے تکلفی اور روانی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں ۔ پدمنی ۔ پدمنی کی چتا ۔ سیتا جی کی گریہ وزاری ۔ مہاراجہ دسرتھ کی بیقراری ۔ جمنا ۔ گنگا پریاگ کا سنگم ۔ ستی ۔ نورجہاں کا مزار ۔ حسرت دیدار اور نلدمنتی اسی قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلیٰ خیالات اور درد و اثر سے مملو ہیں ۔ ان سب میں "گنگا" اور "جمنا" خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں ۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں ۔ "جمنا" میں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں ۔

(۴) سرور کی چوتھی خصوصیت جو اِن کو اِن کے ہمعصروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے

یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اُس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہوگیا۔ علی الخصوص مذہبی نظموں میں اُنھوں نے پُرانے ٹھیٹ ہندی اور بھاشہ کے لفظ بہت اُستادی سے صرف کیے ہیں جن سے کلام کا لُطف دوبالا ہوجاتا ہے اسی طرح راماین اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُرزور لکھے ہیں۔ ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے

سرور کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا۔ مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے اُنھوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کیے ہیں وہ ہرچند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ تقریباً بیس سے کم نہونگی۔ بعض میں انھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اُس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے۔ مرغابی۔ ترانۂ خواب بچہ اور ہلال۔ کارزار ہستی۔ اُمید و طفلی۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دلکش ہیں ایسی ہی نیچرل نظموں میں اُن کی "بیر بہوٹی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

سرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی وعظ و نصیحت کی روکھی پھیکی باتوں سے کم نہونے پائے۔ وہ شاعری کو وعظ پر مقدم جانتے تھے۔ زن خوش خو۔ بے ثباتی دُنیا۔ ادائے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

سُرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق

رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے مثنوی۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ۔ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرضکہ سب اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مگر مسدس ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔

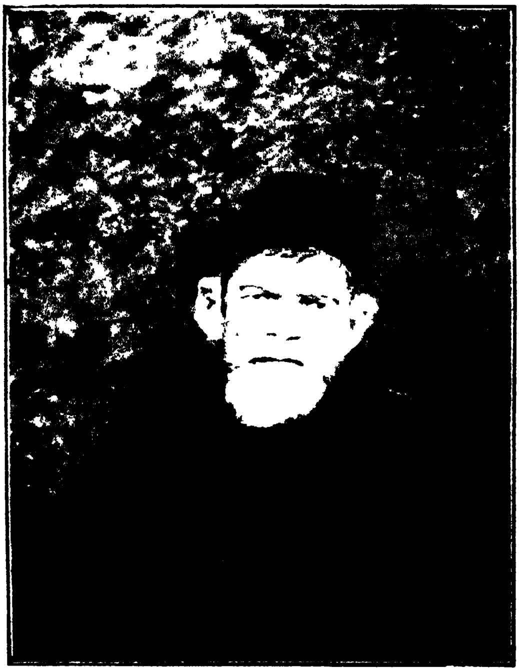
مختصراً ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔ جذباتِ نگاری۔ درد و اثر۔ اعلیٰ تخئیل۔ نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا من و عن اظہار تنوع خیالات اور اُن کا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ میں اور وسیع النظری۔ اُن کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہوا ہے۔ ایک وہ جو زمانہ پریس کانپور سے اُن نظموں کا نکلا جو بہ اوقات مختلف بہ سالہ زمانہ میں خمخانۂ سرور کے نام سے چھپیں۔ دوسرا جامِ سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوا ہے۔ ان کا اکثر کلام ضائع ہو گیا مگر اس سے بھی بڑھکے قابل افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے اُن کا کلام ہتھیا لیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوے اُن سے صاف طور سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے اُن سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور اُن کو اپنے نام سے شایع کرا دیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت کھل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعرا کی صفِ اوّل میں اپنا شمار کرانا چاہتے ہیں دوسروں سے کچھ دے لیکے لکھوا لیتے ہیں اور پھر اُس کلام کو اپنے اسم گرامی کے ساتھ بے تکلف شایع کر دیتے ہیں۔

**اکبر الہ آبادی** اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے انھوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جسکے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اس طرز خاص میں اُنکی نقل

ل محال ہے اُن کا کلام ممتنع التقلید اور ناقابل رسائی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بےمثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے۔ شر کے خطوط بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان سب کے ساتھ ادب سوسائٹی اور حکومت کے زبردست نقّاد اور ماہر سیاسیات تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو یکتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام۔ ۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔ اُن کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوے ۱۸۶۹ء میں ہائیکورٹ کی مثل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۸۸۱ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہو گئے ۱۸۸۸ء میں سبارڈنٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوسے۔ اسکے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کر کے ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔ اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

**اخلاق و عادات** طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روحِ رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جو ان سے ملنے آتے تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارا۔ تہذیب، صداقت، ہمدردی اور مہمان نوازی اُن کے خاص جوہر تھے۔ بعض باتیں جو اُن کے کلام میں "پالیسی" یعنی مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کی جا سکتی ہیں وہ اُن کے اُن خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی۔ عزیز لکھنوی۔ منشی دیانرائن نگم وغیر



امرالله آبادی



...ے نام ہیں انکی راستبازی اور صداقت شعاری پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے بعض ...یسی چیزیں بھی کہی ہیں جنکی اُن سے توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر وہ صرف اس لئے ...ہ وہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے ۔ مذہباً وہ سُنّی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصّب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں ہر چند ...وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی ناروا داری اور عصبیت سے کوسوں دُور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے اُن پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخر الذکر کی وفات پر ایک درد ناک قطعہ لکھا تھا جسکے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جسمیں کہ آئی تھی بہار — اب تجھے پاکر میں لے بادِ بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں بٹھاتا تھا جسے وہ اُٹھ گیا — اب میں اے فرداتری اُمیدواری کیا کروں

**اکبر کی شاعری** اکبر فطری شاعر تھے بچپنے سے اُن کو شعر کا شوق تھا۔ چنانچہ انکا ابتدائی ...کا کلام اُنکی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات اُن کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں ۔ ملازمت کے زمانہ میں انھوں نے انگریزی پڑھی اور اُسمیں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔ اکبر کا دورِ شاعری ایک بسیط دور ہے جسکو اُنھوں نے خود پانچ حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔

**پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک** پہلا دَور ابتدائے مشق سے ۱۸۶۶ء تک کا ہے ۔ اِس زمانہ کا کلام پُرانے رنگ کا ہے۔ جو اُس زمانہ کا رنگ تھا۔ یہ زمانہ اُنکی نو مشقی کا سمجھنا چاہیے۔ اسمیں اُنھوں نے لکھنؤ اور دلّی کے مستند اساتذہ کی تقلید

اور اُن کے رنگ میں غزلیں کہیں اور اکثر مشاعروں میں پڑھیں۔ اُن غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا تھا۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کیجاتی تھی۔ اگرچہ اُن میں کہیں کہیں جذبات عشقیہ بھی ہیں مگر صفائی، سادگی، حُسن بندش، روانی وغیرہ بدرجۂ احسن پائی جاتی ہیں۔ اُس وقت کے کلام سے آئندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ اُسمیں کچھ تصنع بھی شامل ہے۔

**دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۲ء عیسوی تک**

اِس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ اصلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہے اور قادرالکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے مروجہ اور معینہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں اُنپر بھی طبع آزمائی کیگئی ہے۔ تصنع بےتکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ حدود معینہ پر غالب آرہا ہے۔ اشعار نے حشو و زوائد سے پاک ہوکر اپنی کینچلی بدلدی ہے مگر غزلیں اسمیں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہ طور اشعار کے درد و اثر، بندش اور طرز ادا میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔

**تیسرا دور ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۸ء تک**

یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اسمیں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب اُن کے کلام میں پورا اُستادانہ رنگ آگیا اور تجربہ اور نومشقی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ اب کلام میں فکاری کی جھجک اور تردد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق وظرافت کا غلبہ ہے جسمیں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے۔ غزلوں کا رنگ اب پُرانے ڈھنگ سے علٰحدہ ہوکر

ان میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدّتِ ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے
روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرز ادا کے تو
بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے۔ اس زمانہ کا کلام ان کے
کلیات اوّل و دوم میں داخل ہے۔

**چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ عیسوی تک**

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔ اس میں اور دورِ سابق کی نوعیت میں کوئی
زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا متمم ہے۔ اس دور میں اکبر
فی الواقع "لسان العصر" ہو گئے ہیں۔ اس میں قدیم رنگ کی غزلگوئی گھٹتی جاتی
اور حقایق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ اور تیز ہو گئی ہے
اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست نکتہ چینی
کیجاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہو گئی ہے اخلاقی، روحانی،
فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کا کلام میں زور ہے۔ مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے
حسن و عشق کی زیرلبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی مگر وہ اب سیاسیات کے غل غپاڑہ
میں مدّھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صناع کامل ہو گئے ہیں اور کلام میں
پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تموج ہے۔ قوت ابداع و ایجاد فن عروض
کے قواعد اور مشکلات سے دبتی نہیں۔ اظہار خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے
ذہن میں آتے ہیں۔ اور ان کے واسطے نئے نئے دلچسپ قافیوں اور جدید استعاروں
اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

**پانچواں دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک**

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شائع ہو گیا ہے

اِس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہ گیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بانکپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ طویل عمر نے اُن کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقایق سے آگاہ کر دیا ہے اب زندگی اُن کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دُنیا کی بے ثباتی پر اُن کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی اُن کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام بہت ہے۔ اسقدر کہ دو کلیات مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جنکو وہ صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جنکی اشاعت اُن کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اُنھوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمّیٰ بہ "گاندھی نامہ" لکھی جسکو زمان کو ایریشن کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے مگر اس کتاب کو انھوں نے مصلحۃً نہیں شائع کیا۔

اُن کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جنمیں سے دو اُنکی زندگی میں طبع ہوئے تھے اور تیسرا اُن کے صاحبزادہ نے اُن کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی ایک اور شائع ہونے کو باقی ہے۔ اکبر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ اُن کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ اُنھوں نے خواجہ حسن نظامی۔ منشی دیا نراین نگم احسن مارہروی۔ مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبدالماجد بی اے کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں ان سے اُن کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض رنج کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ

سوانحعمری تیار ہو سکتی ہے یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا اُن کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں موجود نہیں ہے۔ اودھ پنچ ہی سے اُنھوں نے غالباً ظریفانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

**اکبر کی غزلیات** چستی بندش، روزمرہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تخئیل، اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دُنیا کی بے ثباتی دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقتی، اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائداری کے مضامین سے مملو ہیں اور درد و اثر اور حُزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت اُن میں موجود ہیں۔ مگر اکبر کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلوں پر مبنی نہیں کیونکہ انسے انکی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار ان کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

## رنگ قدیم

جان نثاروں کے سوا کوئی نہ دیکھے سوئے دوست
چال ہی تیغ قضا کی جنبش ابروئے دوست

رقص کرتی ہی نسیم صبح کیوں مستانہ وار
گلشن دل سے اُڑا لائی ہی شاید بوئے دوست

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
غیرت دامانِ گلچین ہو رہا ہے کوئے دوست

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جسمیں جوہر کے عوض رہتا ہی عکس روئے دوست

لکھا ہوا ہے جور و نامرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہی اُن پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے جواب قاتل زمانہ ہوئی
یہی نظر ہو کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حسن بتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اُسی کی طرف

کوئی پہونچا نہیں ای یار تیرے قد رعنا تک
ہماری فکر عالی سر سے ہو آئی طوبے تک

زمیں پر شمع روشن ہو فلک پر ماہ تاباں ہے
تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنی سے اعلی تک

جو اُسنے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے
خوشی سے یہ ہوے بیخود کہ ہم بھولے تمنا تک

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابی دل ہوں
کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہد معنی
کہیں ہوں محمل لیلی کہیں لیلاے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں

کہیں تصویر حیرت ہوں کہیں محو پریشانی
کہیں ہوں شیفتہ رُخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رُکنے میں ساحل ہوں

## رنگ متوسّط

دُنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہگئی ہے وہ میلا نکل گیا

ہر ارادہ میں نظر آتی ہو اک صورت یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں فسخ عزیمت کے سوا

مطمئن ہو کے لگا تا ہوں لحد میں بستر
اب اُٹھا تا ہی مجھے کون قیامت کے سوا

پیغام آرہا ہے دلِ بیقرار کا
قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

شائق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا
اللہ رے حوصلہ مری مشتِ غبار کا

باغ جہاں میں کوئی روش بےخلش نہیں
دوڑاؤں گل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا

شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر
کیا شعبدہ ہے گردش لیل و نہار کا

اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائیگا

ہے سبب جوش جنوں کا رنج ہجراں اے حضور
آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائیگا

عشق بُت میں کفر کا مجھکو ادب کرنا پڑا
جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا

تجربہ نے حُبّ دُنیا سے سکھایا احتراز
پہلے کہتے تھے فقط مُنہ سے اور اب کرنا پڑا

عالم ہستی کو تھا مدنظر کتمانِ راز
ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

## (رنگ آخر)

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

اسکی پروا نہ رہی خوش رہے دُنیا مجھسے
عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اُس میں
آپ اکبر سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزلِ ہستی سے گذرا دِل مرا | اُنکی نظروں میں سزاوار تمنا کچھ نہ تھا
نہیں ہے کام زباں کا کچھ بجز دعا کے سوا | نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا
کروں کیا غم کہ دُنیا سے ملا کیا | کسی کو کیا ملا دُنیا میں تھا کیا
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل | نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خُدا کیا
وہاں قالوا بلے یاں بُت پرستی | ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

آلہی اکبر بیکس کی ہو خیر
یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا

میرے دل سے امتیاز دی و فردا اُٹھ گیا | حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

جہانِ فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہی اکبر
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکیگا

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا | غور جب ہم نے کیا سانس کو دُنیا پایا

نبی کو سمجھا نہیں ہوں ابتک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا یہی ہے جو ہو رہا ہے

جُدائی نے میں بنایا مجھ کو جُدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خُدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خُدا نہوتا تو میں نہوتا

دو نگاہ ذرا سمجھ کے جواب انکی بات کا | رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا
دہر میں سوختۂ گرمیِ بازار نہ ہو | دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہو
نقش دل ہو صفت معنی رنگیں ای دوست | رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہو
سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر | مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہو

نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع　　وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو
بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل ای اکبر　　برق خرمن کہیں یہ گرمی گفتار نہ ہو

جنون عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے　　یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بیخبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے[ف]　　کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے ماسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

**اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت** اکبر کی خاص شہرت اُنکی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے جو اُن کی نادر نظموں میں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اُن کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اُس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہونچ گیا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں اُنکو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اِس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا اُن کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی اس رنگ نے انکی شوخ طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیے اور اُنھوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کیے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ بیمثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے انکی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں

ف۔ مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ "مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے"۔ ۱۲

کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال رہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔
اُن کا تیسرے دور کا کلام خاصکر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے اسمیں ان کی
ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ
ظرافت کے پردہ میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ اس وقت
اگرچہ وہ نحیف و زار ہو گئے تھے مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ
میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی مسائل کے ادائے مطالب
کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم
حقائق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا حسب ذیل ہیں :۔

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تمثیلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں
برتی جاتی ہیں۔ اُن میں وہ تصنّع اور نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ اُنھیں چیزوں
کا ذکر کرتے ہیں جنکو ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور اُنھیں کے بیان میں
ایک خاص جدّت اور لُطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے با مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ
استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اُس سے
قبل کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور سبک الفاظ جن کو شعرا عام طور پر استعمال نہیں کرتے وہ
شعر میں نہایت جدّت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے

الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً کلّو۔ صلّو۔ بُدّھو۔ جُمّن۔ وغیرہ۔ کہ یہ اُن کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ اُنکو خاص خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ مثلاً گٹ پٹ فالتو۔ یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں مگر اُن کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرا کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوے ہیں مگر اکبر اُن کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اُردو میں ہنوز مروج نہیں ہوے اور کلام میں ثقیل اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں اُنھوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ہنسنا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بذلہ سنجی اور مسخرہ نہ سمجھنا چاہیے، اُسکی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اُس میں نہاں ہوتی ہے۔ اُن کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ اُن کا مذاق عامیانہ اور سوقیانہ ہوتا ہے۔ اُنکی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اُڑاتے بلکہ اُن کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ اُنکی خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندوستان میں

انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسیطرح سوسائٹی کی خرابیوں اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانۂ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب عالم و جاہل ہندو مسلمان سُنّی شیعہ سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لیگئی ہے۔ اُن کے کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو ان میں تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحات یہ ہیں۔ مِس۔ شیخ۔ سیّد۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا مسجد۔ مندر۔ بُت۔ کالج۔ برہمن۔ لالہ۔ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ مِس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پُرانے رنگ کے مُسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تو واقف ہیں مگر انگریزی تہذیب سے بالکل ناآشنا ہیں۔ سیّد سے سرسیّد مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ یا ان کے متبعین یعنی علیگڈھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندوؤں کا اتحاد مُراد ہے۔

اقسام ظرافت — اکبر کی ظرافت مندرجۂ ذیل اقسام پر تقسیم ہوسکتی ہے۔ مذہب۔ سیاسیات۔ تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافتِ الفاظ۔ طنزیات۔

ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

## مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب — فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

چہرے کے نیچے تہہ دو ڈاڑھی کا جھول جھال
اس فرد کو بچائیے تفصیل ذیل سے

بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر
یہاں تو شیخ کو دُھن ہے بگل بجانے کی

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

پیتا ہوں شراب آب زمزم کے ساتھ
رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹمٹم کے ساتھ

ہے عشق حقیقی و مجازی دو نوں
قوّال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کُش مولوی

پیارا ہے ہمکو شیخ ہمارا بُرا سہی
جا تو ولائتی نہیں دیسی چھُرا سہی

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُنکو
دُعا مُنہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

بے نمازوں میں ہیں وہ اور اسپہ شرماتے نہیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن
یک فنا فی الآنرست و یک فنا فی لنڈاوین

شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے
اونٹ کے سب لغات جانتے ہیں

ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض
کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جُمّن

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

## سیاسیات

مرتیوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے اِن وقتوں
الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

مرید اُن کے تو شہروں میں اُڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو

کہدیا صاف ہم نے اے مہراج
ہو مبارک تمھیں یہ کام یہ کاج

ما مقیمان کوے دلداریم
یا ڈپوٹیشن ست یا غم میم

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک دل بستہ ہے
چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

اصل کا اُس بت خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

ممبر علیگڈھ ہیں یا سکھ نداں ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نادان ہیں

## تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوق لیلاے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکیے اب کوٹ کو تہ کیجیے پتلون کو

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی

ہر اک شاخ میں پاس بی اے بولا ہے
مرا لال کالج کا کاکاتوا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے　　　سیّد بھی کو رہے کھسکے برسوں مساس کر کے
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات　　　انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے

## پردہ و تعلیم نسواں

پردہ اُٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں　　　حوریں کالج میں پہنچ جائینگی غلمان تو ہیں
غریب اکبر نے بحث پردہ کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا　　　نقاب اُلٹ ہی دی اُسنے کہکر کہ کریگا ہی کیا مرا کیا
اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق　　　بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں　　　صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے
نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے　　　ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں میسے کا پانی ہے
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　　خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں
ذی علم و مُتّقی ہوں جو ہوں انکے منتظم　　　اُستاد اچھّے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں
ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں　　　میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی　　　اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے　　　بجز اسکے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

## ظرافت الفاظ

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی　　　حنفی نفی ہیں معطّل ہیں ؛
ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں　　　اب ہمارے امام حنبل[1] ہیں
اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے　　　اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

[1] انگریزی میں ہنبل بمعنی عاجز کے ہیں ۱۲

کہاں باقی رہے ہیں وہ اورادِ سحرگاہی
وظیفہ کی جگہ یا پانیر یا آئی ڈی ٹی ہے

گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر
کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وھسکی کبھی ٹی ہے

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

عاشقی کا ہو بُرا اُس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

عہدِ اسلام و عہدِ انگلش میں
سُنیے قول اکبرِ سخنگو کا

پہلے توحید تھی تو اب تحصیل
آگے غل ایک کا تھا اب دو کا

## طنزیات

آبرو اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
نوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی خبط کوئی جج ہے

ہماری مجلسیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بُزِ اخفش تھے قبل اسکے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

حالِ دنیا سے بیخبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بیشک ہیں

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

شیخ جی کو جو آگیا غصہ
لگے کہنے یہ پھینک کر دستا

تم ہو شیطان کے مطیع و مرید
تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید



مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی



مولانا حسرت موہانی

ہے تمھاری نمود بس اتنی ۔۔۔ جس طرح ہو پڑی پہ ڈیہ پہ لید

## استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیر الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں۔

کریما بہ بخشاے بر حال قوم ۔۔۔ صلوٰۃ است رائج در ایشاں نہ صوم

کریما بہ بخشاے بر حال بندہ ۔۔۔ کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ ۔۔۔ مے برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے ۔۔۔ ہر چہ از باپ میرسد نیکوست

ہو گئی اب خیال کی اصلاح ۔۔۔ ہر چہ از آپ میرسد نیکوست

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر ۔۔۔ کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد

ہیٹ را نہ بر سر من جاے دستار العزیز ۔۔۔ مرد تا مسٹر تو اندشد چرا قبلہ شود

عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں ۔۔۔ دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی ۔۔۔ چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناولہا ۔۔۔ کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پاے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلوں ۔۔۔ کہ سر سید خبردار ز راہ و رسم منزلہا

سکۂ زر با بوسے در دھوتی زرتار داشت ۔۔۔ با وجودش نالہاے زار در اخبار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ۔۔۔ گفت ما را خوف فیس ڈٹیکس در ایں کار داشت

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست ۔۔۔ بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

یاد دار ایں قول مولاناے روم ۔۔۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ہم ڈنر خواہی و ہم آر دغ صاف ۔ ایں خیال ست و محال ست و گزاف

اکبر کی سیاسی نظمیں

اس قسم کی نظمیں دو طرح کی ہیں۔ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے۔دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقایق مضمر ہیں۔اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ اُنکی ذاتی ناراضی اور غیظ و غضب بھی شامل ہے۔ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی دور ہو کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اُتر جائے۔اس قسم کے اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گولیوں سے لیتا ہے۔معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔مگر جو لوگ اُن کے انداز طبیعت سے واقف ہیں اُن کے لیے وہ بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کیواسطے وہ ذرا غور و فکر سے کام لے۔سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھلاتے ہیں اُن کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لئے بچھائے گئے ہیں۔سیاسی حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔اُن کے نزدیک سرکاری اسکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلارک لوگ تیار کیے جاتے ہیں اور غلامی ذہنیت اور بڑھائی جاتی ہے اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کستی جاتی ہیں وہ محکمہ سی۔آئی۔ڈی سے معشوق کی کمر کی تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال ۔ خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہی کمر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلایا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی سازوسامان کی چکا چوند سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو اُنکی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں۔ کیونکہ اکبر ایک بڑے شاعر تھے۔ سیاست داں نہ تھے۔ اُنھوں نے علم پالٹیکس کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دیکر پنشن پا گئے تھے اور حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا۔ چونکہ وہ شاعر تھے لہٰذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اِس سے غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ اُن کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اُسکے طرز ادا سے تھا۔ وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے۔ اور چونکہ شاعر تھے لہٰذا نتائج کی گرفت سے بےخوف تھے اُنکی رائیں جیساکہ اُن کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی طرح سیاسیات کی مستند رائیں نہیں شمار کیجا سکتیں کیونکہ اُن کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ فطرتاً بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کرسکتے تھے جسکے نتیجہ میں اُنکو دشواریاں پیش آتیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو۔ اُن کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے خیالات کا اظہار اُس کے بعد ہے۔ وہ کسی گروہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معترف ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت

مخالف ہیں کیونکہ یہ بیدینی اور لامذہبی کا زینہ ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو کسی ریفارمر یا فلسفی کیطرح شرح وبسط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اپنے اشعار میں عجیب مختصر طریقہ سے بیان کرجاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پُرزور بنا دیتا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب میں اُن کو وہ یدطولیٰ حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی کئی معنی نکالتے ہیں جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُنکے نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے ہماری خوشامد اور گڑگڑانے سے اوراسی طرح آہ وزاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ یہ قوے کا بیکار مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اِسی طرح اُنھوں نے کانگریس کی کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں" اور جابرانہ" حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اُڑایا ہے یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں چھپے ہوے ہیں معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفراں زار ہیں مگر چشم حقیقت بیں انکی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے۔ اُن کے اشعار میں محض سماعی اثر سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں ان کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آیندہ اجتناب کریں۔ اُن کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے اسواسطے کہ ادنےٰ سے اعلیٰ اور عامی سے عالم تک اُن کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُن کا مطلب نکال کر اُن سے محظوظ ہوتے تھے۔ اُن کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے کہ اُردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اُسکو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے

لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت مادیت پر ضرور غالب آئیگی۔ تمام سیاسی مشکلات کا اُن کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت خداوندی پر پورا بھروسا رکھا جائے۔

**اکبر بحیثیت نکتہ چین سوسائٹی** اکبر کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اثر کر گئی تھی جسکی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگاہ تھا۔ مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو اسمیں خاص لطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں۔ وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام۔ یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی۔ انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کیجاتی تھی مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پالیا تھا قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی یہی پر آشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام بین ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آیندہ خطرے سے واقف تھے۔ اُنھوں نے اُن تیز رفتار لوگوں کو جو شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے

خطرات سے آگاہ کیا۔ بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹر جی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اسنے اپنے پُرزور اور دلچسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اُڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین وعظ و نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اکبر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر اُن کا حربہ بجائے نثر کے نظم تھا۔ اُنھوں نے بھی اُس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرز و روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اُڑایا ہے مگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ اُنھوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کرکے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیخ و بُن سے اکھاڑنا چاہا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پبلک اُن کے ساتھ نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے اُنکی شہرت پر کسی[1] قدر اثر پڑا۔

اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متأثر ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اُن کے

---

[1] یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبر ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص اُن کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا۔ وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر جب اِس ترقی و تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس سے اُنکے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو اِن کے کمال فن کی قائل اور معترف نہو محض اسوجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ برعکس اسکے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

خواب غفلت سے چونکانے اور اُن کو قعرِ ذلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے
برخلاف اس کے اکبر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اسکی ہر بات ماننے کے مؤید
نہ تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمامتر بُری اور ناقابل
تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اُسکے مخالف چلنا عقل کی بات
نہیں ہے۔ اکبر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اسمیں مذہب کو بالکل بھلادیا گیا
ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہوکر مذہب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ پردے
کے قیود کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اس میں
بڑے بڑے نقصان ہیں۔ اُن کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ و امریکہ وغیرہ میں
اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔
وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان
میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہوگا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی
تہذیب و تمدن میں بعد المشرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات
رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح
کی تدابیر ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اسمیں اور ان میں زمین و آسمان کا
فرق ہے۔ اسیطرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں کے بھی سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے
عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑیگا۔ انھیں وجوہ سے اُنھوں نے مغربیت پسندی
کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اُڑایا ہے اور جا بجا اسپر طنز کیے ہیں۔ ہندوستانی عشاق
کو انکی رائے میں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربانِ یورپ سے لینا پڑیگا۔ اور ہندوستانی
معاشیق کو ادا و ناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یورپین ہمجنسوں سے سیکھنا پڑے گا

یٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور
علاق ہر چیز میں اِک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے۔ پُرانے قومی آئیڈیل لوگ کھو بیٹھے یا انکو
مدا حوالہ ماضی کردیا۔ علما و عرفا نے اپنی قدیمی وضع چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی
ختیار کرلی صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علما مثل سابق کے
شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں "چراغ خانہ" سے "شمع انجمن" بن گئیں۔ مادیت کا
زور دورہ ہے۔ قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چاپلوسی
ٹھہرادیا۔ غرضکہ یہ امور مذکورۂ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم
کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے۔ اسی انتہائی قدامت پسندی کیوجہ سے وہ سرسید اور
ن کے متبعین یعنی تعلیم علیگڈھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے جسقدر سرسید کی رفتار
اُن کے نزدیک تیز تھی اسیقدر ہمارے نزدیک اُنکی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم
کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کیے جاسکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں بلکہ وہ قومی
تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیاے علوم قدیم اور
اُن خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہوگئی ہیں دور کرنے
کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً خلاف نہیں مگر اسکا صحیح طریقہ پر رواج
چاہتے ہیں۔ اُنکی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پاکر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔
قومی جائداد نہ بنیں۔

دُوا سے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
وہ پرانی پاس وضع۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے

فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایۂ ناز صفات پالسی ۔ دورروئی ۔ خودغرضی ۔ بے حمیتی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں ۔ اُن کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین و دوسرے لوگوں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس اُنکے دل سے اُٹھ گیا ۔ دُنیا کے بکھیڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں ۔ یہ مادہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کے معجزنما اثرات کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا ۔ موجودہ دور کی سائنس کی معجزنمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر آفرینیاں سراپا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں ۔ مرگ ناگہانی جو اکثر کثرت اضطراب اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اُسی کے برکات ہیں ۔ جدید طریقۂ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا اخلاقی و روحانی امراض کے لیئے اکسیر صفت ثابت نہیں ہوا سائنس کی ترقی اور نیچر کی مغلوبیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کیئے جنکے رفع کرنے کی امید کیجاتی تھی ۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان میں ایک عمیق خلیج حائل ہے مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہائے نظر روحانی ترقی ہے وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہوجاتی ہے، فتوحات اور ملک گیری کا اسکو شوق نہیں قناعت اور تسلیم و رضا اُسکا آئین ہے ۔

**اکبر کے مذہبی عقائد** علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم، ریفارمر، واعظ اور فلسفی بھی تھے وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر دعا کے دل سے قائل تھے، اُن کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اسمیں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں ۔

[redacted]



وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے مذہب اُن کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے اُسکو چند آرا اور حقایق فلسفیانہ کا مجموعہ سمجھنا چاہیے اگر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کرسکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے اُن میں تعصب اور کٹرپن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ ملائیت کی تنگ خیالی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع النظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہو۔ اُن کا قول ہے کہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقایق و معارف کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ظواہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور افعال و اطوار مثل مغز کے۔ وہ تعصب و غصہ کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کردیتی ہے۔ آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے۔ ایک جگہ اُنھوں نے معاوضۂ آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے ۔

**نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء** نادر علیخاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے۔ اس رنگ میں انکی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد و اثر اعلیٰ تخئیل حب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں۔ یہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ اُنھیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اُردو میں بھی داخل

ہو جائے۔ انکی نظمیں "شمع و پروانہ"، "شعاع امید"، "پیکر بے زبان"، "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں۔ اُن کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین"، اور "مادر ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی مشہور کتاب "لالہ رُخ" کے طرز پر اُنھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رُخ رکھا ہے۔ اُن کا انتقال عین جوانی یعنی پنتیالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اِس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دُنیا نے جو امیدیں انکی ذات سے قائم کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا۔

## حصّۂ نظم تمام ہوا

ممبران ھندوستانی اکاڈمی سنہ ۱۹۲۸ع



(۱) بیٹھے ہوئے (بائیں جانب سے) پروفیسر حامد علی — ستار متھوری — پروفیسر ناصری — سید مسعود حسن رضوی — بابو شیام سندرداس —
لالہ سیتا رام — سویدھم بہادر سنہ — (پریسیڈنٹ) راجہ راجیشور بلی (وزیر تعلیم سابق) — بابو جگن ناتھ داس رتناکر — پنڈت اجودھیا سنگھ
اپادھیائے — پنڈت رام نراین مصر — پنڈت سری دھر پاٹھک —

(۲) کھڑے ہوئے (بائیں جانب سے) مولانا صفی — مرزا محمد عسکری — سید سجاد حیدر یلدرم — بابو دھریندر ورما — پنڈت بدری ناتھ بھٹ —
• ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی — پروفیسر نعیم الرحمن — رام بابو سکسینہ — منشی پریم چند۔

(۳) پچھلی صف (بائیں طرف سے) ڈاکٹر تارا چند (سکریٹری) — پنڈت منوہر لال جوتسی — ڈاکٹر بینی پرشاد — بابو دیا نرائن نگم —

# انڈکس حصۂ نظم

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

---

نمبروں سے صفحات مراد ہیں